ہدیۂ خلوص
بگرامی حضرت :
حضرت مولانا فضل الرحمن قاسمی مدظلہ
نائب شیخ الحدیث دار العلوم سبل السلام حیدرآباد
بمخلص حضرت مولانا محمد بدر الحسن القاسمی مدظلہ، نزیل کویت
بعلم ۲۰۰۹ء دعا گو حسن، دعا گو حسن حیدرآباد
مورخہ: ۲/۸/۱۴۳۱ھ

إنَّا للهِ وإنَّآ إليهِ رَاجعُونَ

آزمائش کی گھڑی میں صبر کا دامن

بیٹے پھر ماں کی جدائی پر

{ اَشکوں سے بھرا دامن زخموں سے بھرا سینہ }

بدر الحسن القاسمی

کاشانۂ علم و ادب - نئی دھلی

Missing: 48-49

جُملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

عنوان : آزمائش کی گھڑی میں صبر کا دامن
تحریر : مولانا بدرالحسن القاسمی
صفحات : ۱۵
کمپوزنگ : ولی احمد سبیلی (کویت)
طبع اوّل : ۲۰۱۰ء
قیمت :

ناشر

کاشانۂ علم و ادب
ابوالفضل، نئی دہلی (الھند)

ملنے کا پتہ:

☆ قاضی پبلیشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، بی-۵۳، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی-۳۱
☆ مکتبہ عزیزیہ، جامع مسجد-دہلی
☆ دارالعلوم سبیل السلام، مدینۃ العلم، صلالہ بارکس، حیدرآباد

عنوانات

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
(۱)	غم کے آنسو	۵
(۲)	جواں سال بیٹے کی موت کا غم	۸
(۳)	ماں کی موت کا سانحہ	۳۳

إن القلب ليحزن، وإن العين لتدمع، وإنا لفراقك يا "محمد" لمحزونون ولا نقول إلا ما يرضى الله سبحانه

.....وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ ○ الَّذِيْنَ إِذَآ أَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ○ أُولٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ، وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ○ (البقرہ: ۱۵۵-۱۵۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

غم کے آنسو

"زندگی" اور "موت" کے درمیان چولی اور دامن کا رشتہ ہے چنانچہ خود "زندگی" کا آغاز ہی "موت" کا پیغام بھی ہے، جب زندگی ایک بار مل گئی ہے تو پھر موت کا مزہ چکھنا ہی ہے، اس کے باوجود آدمی بچہ کی پیدائش پر خوشی مناتا ہے اور اسکی موت پر رنج وغم میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

پھر جس طرح ہر شخص کی زندگی ایک طرح کی نہیں ہوتی اور ہر ایک کا رنگ ڈھنگ الگ الگ ہوتا ہے اسی طرح موت بھی ہر کسی کی یکساں نہیں ہوتی، چنانچہ ایک شخص کی موت سے بلا ٹلتی ہے اور اس سے دنیا کو راحت ملتی ہے جبکہ دوسرے شخص کی موت پر صرف عزیز واقارب ہی نہیں روتے بلکہ زمین وآسمان بھی اشکبار ہوجاتے ہیں، اور بعض کی موت تو ایسی ہوتی ہے کہ اس پر عرش الٰہی بھی ہل جاتا ہے۔

جواں سال بیٹے پھر والدہ ماجدہ کی صرف ایک ہفتہ کے فرق سے موت نے مجھ پر رنج وغم کا جو ناقابل تحمل بار ڈالا ہے اس پر حضرت فاطمہؓ کی طرح کہہ سکتا ہوں کہ

صبت علی مصائب لو أنها صبت علی الأیام صرن لیالیا

مجھ پر غم والم کے پہاڑ اس طرح ٹوٹے کہ اگر دنوں پر یہ ٹوٹتے تو شدتِ غم سے وہ رات ہوجاتے۔

پھر ایک طرف غم بالائے غم کی شدت اور دوسری طرف صبر واحتساب کا شرعی تقاضا، نتیجہ میں زبان گنگ، دماغ ماؤف، دل شکستہ اور آنکھیں اشکبار۔

ایسی سنگین آزمائش کے وقت سہارا اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ رب کائنات کی رحمت ومغفرت اور دوست واحباب کی دعاؤں کا جنکا حاصل بھی رحمت حق کو متوجہ کرنے کی مزید کوشش ہی ہے۔

اللّٰہ کا فضل ہے کہ ہند وبیرون ہند سے عرب اور غیر عرب سبھی مخلصین نے غم ہلکا کرنے یا میرے غم میں شریک ہونے کی بھرپور کوشش کی، اور ایک طرف مجھے صبر واستقامت کی تلقین کی تو دوسری طرف مرنے والوں کیلئے دعاؤں اور ایصال ثواب میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

بہت سے ارباب مدارس نے قرآن خوانی کا اہتمام کیا تعزیتی جلسے کئے، اخبارات کے ذریعہ میرے دکھ درد میں شریک ہونے کی کوشش کی اور مکہ مکرمہ کے اردگرد رہنے والے متعدد احباب نے تو مرحومین کیلئے عمرے بھی کئے اسلئے اللّٰہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ امید قائم ہوتی ہے کہ مرحومین کے حق میں معصوم بچوں اور اتنے سارے لوگوں کی بے لوث دعائیں یقیناً برزخ اور آخرت میں راحت وسکون کا باعث ہونگی۔

زیر نظر تحریر نہ کتاب ہے نہ رسالہ اور نہ کوئی علمی وتحقیقی مضمون یا مقالہ، یہ محض دل کے زخم اور آنکھوں کے آنسو ہیں جو الفاظ کے پیرہن میں ظاہر ہوگئے ہیں، یا بے ساختہ قلم کی نوک سے ٹپک پڑے ہیں ورنہ اتنے سنگین حادثہ پر حواس باختگی اور دل شکستگی کر عالم میں اتنا ہوش ہی کہاں رہ جاتا ہے کہ کوئی مضمون

لکھا جائے یا کوئی کتاب تصنیف کی جائے۔

اس تحریر کو مطبوعہ شکل میں پیش کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ مرحومین کیلئے مغفرت ورحمت اور میرے لئے عافیت وحسن عاقبت کی دعا پر آمین کہنے والوں میں آپ بھی شامل ہوجائیں۔ رب رحمن ورحیم اور غفور وکریم کی رحمت کاملہ وشاملہ ہم سبھوں کو اپنی آغوش میں لے لے۔ یہی زندگی کا حاصل ہے اور اسی میں اُخروی فوز وفلاح کی ضمانت بھی ہے۔ وما ذلک علی اللّٰہ بعزیز

سوگوار لیکن رب کی رحمت کا امیدوار

بدرالحسن القاسمی

آنچہ من گم کردہ ام

جواں سال وباکمال بیٹے کی موت کا غم

بدرالحسن القاسمی

آہ.....میرا لخت جگر ''محمد''، جس کے لئے اللہ نے عمر کی صرف ۲۳/ بہاریں ہی لکھی تھیں۔ کویت میں پیدا ہوا، خالص عربی ماحول میں نشو ونما پائی، عربی مدارس وجامعات میں تعلیم حاصل کی اور تقریباً ۵/۶ سالوں کی غریب الوطنی اور شب وروز کی محنت کے بعد اُردن یونیورسٹی سے گریجویشن کرنے کے بعد اُردن ہی کی ایک دوسری یونیورسٹی میں ماجستیر (ایم، اے) کے مرحلہ تک پہنچا، تمہیدی کورس کے بعد مقالہ کیلئے ایک نئے اور اچھوتے موضوع کا خاکہ پیش کر کے منظوری لی کہ اچانک اس کا وقت موعود آ پہنچا اور وہ غم سے نڈھال باپ اور بلکتی سسکتی ماں ہی نہیں بھائیوں بہنوں اور سیکڑوں ساتھیوں اور اساتذہ کو سوگوار چھوڑ کر اللہ کو پیارا ہو گیا، اور رب کائنات نے اسے اپنی آغوش رحمت میں بلا لیا۔ اور مسجد اقصیٰ سے قریب اُردن کی وہی سرزمین جہاں وہ حصول علم کے لئے گیا تھا اور وہی جگہ جو ارض محشر بھی ہے، اور جہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دسیوں جانباز صحابیؓ مدفون ہیں جنت سے پہلے کی اس کی آرامگاہ بن گئی اور وہ ہمیشہ کیلئے اس سرزمین کا حصہ بن گیا إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

عام طور پر ان بچوں کو یتیم کہا جاتا ہے جن کے سر سے ماں باپ کا سایہ بچپن میں اٹھ گیا ہو لیکن محمد کا معاملہ یہ ہے کہ اس نے اپنے ادھیڑ عمر باپ کو یتیم کر دیا ہے جس کو اپنے ایک ایسے ہونہار بیٹے کا غم نڈھال کئے ہوئے ہے، جو اس کا صرف نسبی نہیں علمی سہارا اور فقہی شرعی وادبی مرجع بھی

بن چلا تھا، اور جس سے طرح طرح کی توقعات اس نے قائم کر لی تھیں، اور جو ایسی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھا کہ نہ صرف باپ کے علمی خاکوں میں رنگ بھر سکتا تھا بلکہ خود جدید فقہی مسائل کے حل کی ایک نئی راہ بھی کھول سکتا تھا۔

جس رب کائنات نے اپنی آغوش رحمت میں اسے لیا ہے اب اسی کی ذات سے یہ امید بھی ہے کہ اس کے ''یتیم باپ'' کی ناطاقتی پر رحم کرے، اس کے احساس زیاں کو دور کرے اور اسے مزید آزمائشوں میں نہ ڈالے، ایسے جواں مرگ بیٹے کی موت پر صبر ورضا کا دامن تھامے رکھنا بھی رب غفور ورحیم کی اعانت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

محمد کی فطری صلاحیت، زبان وادب پر اس کی قدرت، فقہ واُصول سے مناسبت اور پھر مستقبل کے عزائم اور علمی بلند پروازیوں کا خیال آتا ہے تو دل ٹوٹنے لگتا ہے اور سوز اندرون سے ہڈیاں پگھلنے لگتی ہیں، اور اس کی اعلیٰ ڈگریوں، علمی سرگرمیوں اور حاصل کردہ تمغوں اور شہادتوں پر نظر پڑتی ہے تو صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا ہے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، نہ پاؤں تلے زمین محسوس ہوتی ہے اور نہ سر کے اوپر آسمان۔

اندرونی حال یہ ہے کہ ''اگر گویم زباں سوزد نہ گویم مغز استخواں سوزد''

مجھ جیسا جسمانی وایمانی ہر لحاظ سے ضعیف وناتواں شخص حضرت عروہ بن الزبیرؒ کا حوصلہ کہاں سے لائے جنہوں نے ایک ہی دن میں ایک ٹانگ کٹ جانے اور ایک بیٹے کے مرجانے پر رب کائنات کے سامنے دست عاجزی بلند کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''اے اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے دو ہاتھ اور دو پاؤں دیئے تھے جن میں سے ایک تو نے لے لیا اور تین باقی چھوڑے ہیں اور ۶/ بچے دیئے تھے جن میں سے ایک کو تو نے لے لیا ہے اور پانچ باقی چھوڑے ہیں''۔

ہماری دعا تو یہی ہے کہ اے اللہ ہمیں ایسی آزمائشوں میں نہ ڈال جس کا تحمل ہم نہ کر سکتے ہوں اور ہمیں دنیا میں عافیت اور آخرت میں عفو سے بہرہ ور فرما، اور جانے والے بیٹے کو فردوس بریں میں جگہ دے۔ وہ تیرے دین کی تعلیم ہی کیلئے وقف تھا، اسے اس کے ماں باپ کیلئے ذخیرہ آخرت کی حیثیت سے قبول فرما اور ہمیں ہر طرح کے ہم وحزن سے نجات عطا فرما۔ بہر حال آقائے کائنات، فخر موجودات محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثۂ وفات سے بڑھ کر تو کوئی دوسرا حادثہ نہیں ہوسکتا جس نے عرش وفرش کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور جس نے کتنی ہی زبانیں گنگ کر دی تھیں، کسی کی بینائی لے لی تو کوئی تلوار سونت کر یہ کہتے ہوئے خود ربودگی کے عالم میں باہر نکل آیا کہ جس کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرجانے کا ذکر کیا اس کا سر تن سے جدا کر دوں گا۔ لیکن موت تو برحق ہے اور جانا تو ہر کسی کا یقینی ہے اور ﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَّإِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ تو فرمان باری ہے۔ اور ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ (ہر کسی کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے) پھانسی کے اس عام اعلان کے بعد بھی کیا کوئی شخص بچ سکتا ہے؟ لیکن انسان بہر حال انسان ہے اتنے سنگین حادثہ کے بعد ''من كان يعبدُ محمداً فإنَّ محمداً قد مات، ومن كان يعبدُ الله فإن الله حَيٌّ لايموت'' (جو کوئی محمد کی پرستش کر رہا تھا اسے یقین کر لینا چاہئے کہ محمدؐ تو اب دنیا میں نہیں رہے، اور جو کوئی رب کائنات کی پرستش کر رہا تھا اسے یقین ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ زندہ جاوید ہے اس پر موت طاری نہیں ہوسکتی) کے اعلان کا حوصلہ صدیق اکبرؓ میں ہی ہوسکتا تھا۔

محمد اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد سے تو نہ جانے کتنے محمد نام رکھنے والے اس دنیا سے گزر چکے ہیں، سمرقند کے قریب ''تُرْبَةُ الْمُحَمَّدِيين'' کے ایک ہی مقبرہ میں چند صدیوں کے اندر ہی چار سو سے زائد محمد نام رکھنے والے علماء روپوش ہو چکے تھے۔ محمد بن سیرین، محمد بن الحسن الشیبانی اور محمد بن اسماعیل البخاری بھی تو اس دنیا سے جا چکے ہیں۔

حجاج بن یوسف ثقفی نے ایک دن خواب دیکھا کہ اسکی دونوں آنکھیں نکال لی گئی ہیں، اس نے بدشگونی لیتے ہوئے اپنی دو بیویوں کو طلاق دیدی پھر تھوڑی ہی دیر بعد اسے خبر ملی کہ اس کا بیٹا محمد اور بھائی جس کا نام بھی محمد تھا دونوں انتقال کر گئے تو کہنے لگا کہ:

والله، هذا تأويل رؤياى من قبل. إنا لله وإنا إليه راجعون

(خدا کی قسم میں نے جو پہلے خواب دیکھا تھا اسکی تعبیر یہی ہے۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون)

ایک ہی دن میں ایک محمد کا پھر دوسرے محمد کا انتقال!

مشہور شاعر فرزدق نے اسی کے بارے میں کہا ہے کہ:

إن الرزية لا رزية مثلها	ایسی مصیبت کہ جس سے بڑھ کر کوئی مصیبت
فقدان مثل محمد و محمد	نہیں ہوسکتی، ایک ہی دن میں ایک محمد کے
	بعد دوسرے محمد کے انتقال کا حادثہ ہے۔

امام ذہبیؒ نے ایک شخص کا ذکر کیا ہے جس کی ۱۴ ر پشت تک سب کا نام محمد بن محمد ہی رہا ہے، انہیں محمد نام رکھنے والوں میں ''محمد بدر القاسمی'' بھی تھا جو طلب علم کی راہ اور غریب الوطنی کی حالت میں اور ماں باپ اور اہل خاندان سب سے دور رہتے ہوئے اللہ کو پیارا ہو گیا۔

ایسے بیٹے کا چلا جانا یقیناً ایک سانحہ ہے، اور ایسا سانحہ جس پر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن اللہ کا ہی وہ عطیہ تھا اور اسی نے اپنی حکمت ومصلحت سے اسے ہم سے جدا کر دیا ہے۔ ہمارا حال اس حادثہ پر وہی ہونا چاہئے جو حبیب کبریا احمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے معصوم بیٹے حضرت ابراہیمؓ کی وفات پر تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا اور زبان مبارک پر غم والم کے اظہار کے ساتھ تسلیم ورضا کے یہ کلمات جاری تھے: '' إن القلب ليحزن وإن العين لتدمع ولا نقول إلا مايرضى الله سبحانه وإنا لفراقك

یا إبراهيم لمحزونون (دل غموں سے نڈھال ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں لیکن زبان سے ہم صرف وہی بات کہہ سکتے ہیں جو اللہ کو پسند ہے، اے ابراہیم! تمہاری جدائی پر ہم سبھی مغموم ہیں) تقدیر پر ایمان اور اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنا اگر جزو ایمان نہ ہو اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ مبارک نظروں کے سامنے نہ ہو تو اتنے بڑے حادثہ پر نہ جانے انسان کا کیا حال ہو اور اس سے کس کس طرح کی قولی و عملی بے احتیاطیاں سرزد ہونے لگیں؟ محض اللہ کے کرم اور اسکی رحمت کی امید اور اس کی حکمت پر یقین کا سرمایہ ہی ہے جو انسان کے لئے بڑی سے بڑی مصیبت میں سہارے کا کام دے سکتا ہے۔

- اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔
- جو مصیبت آتی ہے وہ پہلے سے لکھی ہوتی ہے۔
- موت وقت سے پہلے نہیں آتی اور نہ اس کو اس کے وقت سے ٹالا جا سکتا ہے۔
- اللہ تعالیٰ جب کسی بات کا فیصلہ کرلے تو اللہ کے علاوہ کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔
- ساری کائنات مل کر بھی اللہ کا اگر فیصلہ نہ ہو تو ایک ذرہ کا فائدہ پہنچا سکتی ہے اور نہ کسی کا ایک بال بیکا کر سکتی ہے۔
- اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔
- آخرت کی زندگی دنیا سے بہتر ہے۔
- جنت کی نعمتیں دائمی اور ابدی ہیں۔

ایمان کے یہ وہ اجزائے ترکیبی ہیں جو تسلیم و رضا کی راہ کھولتے ہیں۔

مصیبت پر صبر بڑا مشکل اور جانگداز مسئلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی کو مصیبت میں مبتلا نہ کرے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے امتیوں کو یہی تلقین فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے عفو و عافیت

اور دنیا و آخرت میں آرام و راحت مانگا کرو۔

امام ابن عیینہ نے بڑا لطیف نکتہ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے قرب و وصال کی ایک راہ تو وہ ہے جس پر حضرت ایوب علیہ السلام گامزن تھے، سخت اذیت و تکلیف اور مسلسل جانگسل بیماریوں کے باوجود سرتاپا صبر و استقامت بنے رہے اور رب کائنات سے اپنے دکھ کا اظہار بھی کیا تو بڑے لطیف انداز پر

﴿إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ﴾ (اے پروردگار ہمیں تکلیف اور مصیبت لاحق ہے اور آپ ارحم الراحمین ہیں) یقیناً تسلیم و رضا کا یہ بڑا عظیم مقام ہے لیکن اس طرح کا حوصلہ ہم جیسے کم ہمتوں کو کب ہو سکتا ہے۔ امام ابن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ اس کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کے قرب و وصال اور اسکی رضا کے حصول کا ایک راستہ وہ بھی ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے اختیار فرمایا تھا کہ: ﴿رَبِّ هَبْ لِي مُلْكًا لَّا يَنبَغِي لِأَحَدٍ مِّن بَعْدِي﴾ (اے اللہ ہمیں ایسی سلطنت عطا فرما جو پھر کسی اور کو میرے بعد نہ ملے) لیکن انسانوں کے علاوہ جنوں اور پرندوں اور ہواؤں تک پر حکمرانی کے باوجود کبھی ان کے سر میں غرور کا نشہ سوار نہیں ہوا اور وہ رب کائنات کی عظیم نعمتوں پر ہمیشہ سربسجود ہی رہے۔ اُسوۂ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ تو غم کے احساس سے منع کیا گیا ہے اور نہ غم کے اظہار سے کیونکہ غم پر ہنسنا فطرت انسانی کے خلاف ہے۔ دل کا غم آنکھوں سے چھلک آئے یہ بھی دین کے منافی نہیں، بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت ابراہیمؓ کی موت پر آبدیدہ ہو جانا اور آنکھوں سے آنسو کا ٹپکنا ثابت ہے بلکہ زبانی طور پر یہ کہنا بھی ثابت ہے کہ: إن القلب ليحزن، وإن العين لتدمع۔ (دل غمزدہ ہوتا ہے اور آنکھیں بھی اشکبار ہوتی ہیں) البتہ زبان پر کوئی ایسی بات نہیں آنی چاہئے جو جذبۂ تسلیم و رضا کے منافی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ فضیل بن عیاض کے صاحبزادہ کا انتقال ہوا تو دفن کے بعد انہوں

نے اپنے صبر وضبط اور تسلیم ورضا کا اظہار قبرستان میں قہقہہ لگا کر کیا۔ امام ابن تیمیہؒ نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ایسے موقع پر قہقہہ لگانا نہ کمال کی دلیل ہے نہ شریعت کی تعلیمات سے ہم آہنگ، فطرت انسانی سے ہم آہنگ بات یہی ہے کہ حضور کے اس اُسوہ کو اپنایا جائے کہ آنکھیں اشکبار بھی ہوں، دل میں غم والم کی ٹیس بھی محسوس ہو، مرنے والے کی جدائی کے شاق ہونے کا اظہار بھی۔ البتہ زبان پر تسلیم ورضا کے کلمات کے علاوہ کچھ اور نہ ہو۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے حادثہ جانکاہ کے بعد ہر حادثہ اس سے کمتر ہے۔ کسی نے صحیح کہا ہے:

تذکرت لما فرق الدهر بيننا	جب زمانہ نے ہمیں ایک دوسرے سے جدا
فعزيت نفسي بالنبي محمد	کردیا تو حضورؐ کے حادثہ کو یاد کر کے اپنے نفس کو ہم نے تسلی دی
وقلت لها إن المنايا سبيلنا	اور اس سے کہا کہ موت تو ہم لوگوں کیلئے
فمن لم يمت في يومه مات في غد	ناگزیر ہی ہے لہٰذا جس کی موت آج واقع نہیں ہوئی تو کل کے دن ہو جائے گی

دراصل زندگی خود ہی سب سے بڑی بیماری ہے، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے بقول ''جس کو یہ لگ گئی اس کو بہر حال مرنا ہی ہے، دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں گزرا جسے زندگی کا روگ لگا ہو اور پھر وہ نہ مرا ہو''۔

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ (ہر جاندار کو موت کا مزا چکھنا ہی ہے) انسان کی برتھ سرٹیفکیٹ ہی اس کی وفات کا گوشوارہ بھی ہے جس پر اس کی مقرر شدہ زندگی کا ہر لمحہ درج ہوتا رہتا ہے اور ہر دن زندگی کا ایک ایک صفحہ الٹتا رہتا ہے۔ طے شدہ زندگی کے سانس بھی جب گنے

ہوئے ہیں تو ان کو ایک نہ ایک دن ختم ہونا ہی ہے اسی لئے کسی بزرگ نے فرمایا ہے کہ: ''إذا كانت الأنفاس بالعدد وليس لها مدد فما أسرع ماينفد''۔

(جب زندگی بھر کے سانس گنے چنے ہیں، اور ان میں اضافہ کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے تو پھر ان کو گزرتے ہوئے دیر ہی کتنی لگے گی)

مرحوم کے چلے جانے کے غم کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ''نئے فقہی مسائل'' کو سمجھنے اور محنت کر کے ان کا حل تلاش کرنے کی اس میں اچھی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی جس کا اندازہ اس کے ماسٹر کے رسالہ کے عنوان سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ''المال المختلط في الفقه الإسلامي وتطبيقاته المعاصرة'' کا موضوع کوئی پختہ ذہن اور بلند حوصلہ شخص ہی اختیار کر سکتا ہے کیونکہ اس موضوع پر ماہرانہ انداز سے لکھنے کے لئے بڑی محنت اور غیر معمولی تحقیق و جستجو کی ضرورت ہے۔ تدفین کے بعد مرحوم کے رہائشی کمرے میں جب دل پر پتھر باندھ کر میں داخل ہوا تو بکھرے ہوئے اوراق میں درج ذیل موضوعات پر مضامین کے مجموعے بھی ملے جنمیں سے بعض گریجویشن کے زمانہ کے لکھے ہوئے ہیں اور بعض بعد کے، عنوانات یہ ہیں:

- الترجيح بين المتعارضات (متعارض دلیلوں کے درمیان ترجیح کے اُصول)
- التفريق للعيب بين الزوجين (عیب کی بنیاد پر زوجین کے درمیان تفریق)
- الرجوع عن الشهادة بعد الحكم (قاضی کے فیصلہ کے بعد گواہی سے رجوع کا حکم)
- مقدار قيمة دية المرأة المسلمة (مسلمان عورت کی دیت کی مقدار)

اور متعدد نسخے ''المال المختلط في الفقه الإسلامي'' کے کچھ فقہی مذکرات اور یونیورسٹی کے نصاب کی اور دوسری فقہی واَدبی موضوعات پر کتابیں ع

بعد مرنے کے میرے گھر سے یہ ساماں نکلا

ان عنوانات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مرحوم میں علمی پختگی اور ذہنی صلاحیت کتنی زبر
تھی؟ ''محمد بدر القاسمی'' کی جدائی پر زیادہ غم کی اور بھی کئی وجوہ ہیں: محمد نے کویت کے سرکار
اسکولوں میں ابتدائی، میڈل اور پھر ہائر سکنڈری کی تعلیم حاصل کی، وہ بچپن سے اپنے کلاس
ممتاز رہا، کئی بار امتیازی نمبرات لانے پر اسے میڈل ملے، پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے اُردن گ
وہاں بھی ''جامعۃ الزرقاء الجامعۃ الأردنیۃ'' پھر ''جامعۃ العلوم الإسلامیۃ'' میں علمی اور اخلاقی دونو
لحاظ سے نمایاں رہا اور طلبہ واساتذہ میں اسے بڑی محبوبیت حاصل رہی۔ محمد کی پیدائش
جولائی ۱۹۸۶ء کو کویت میں ہوئی تھی اور اُردن میں اس کی وفات کی تاریخ ۲۹ رجنوری ۲۰۱۰
ہے۔ اصل زبان شروع سے اس کی عربی ہی رہی، اردو کے جملے عام طور پر شکستہ ہوجایا کر
تھے بلکہ زائد زبان کی حیثیت سے اُردو سیکھنے کیلئے اُردن میں رہتے ہوئے ایک استاذ سے کلا
بھی اس نے لیں۔ اس کو اصل دلچسپی کتابیں پڑھنے سے تھی۔ عرب اُدباء کی کتابیں اس
کویت میں رہتے ہوئے ہی ہضم کرلی تھیں، عباس محمود العقاد اور طٰہٰ حسین وغیرہ کی جو کتابیں
پڑھ ڈالیں۔ زندہ لکھنے والوں میں غازی القصیبی، ترکی الحمد وغیرہ جیسے لکھنے والوں کی کتابیں
پڑھنے کی عادت تھی جس سے میں روکنے کی کوشش کرتا تھا۔ بہت ہی کم عمری کی حالت میں
الرحمٰن رأفت الباشا کی مشہور کتاب ''صور من حیاۃ الصحابۃ'' اس نے اس طرح پڑھی تھی کہ
بلفظ زبانی سنایا کرتا تھا۔ درسی کتابوں کے علاوہ دیگر کتابوں سے اس کی واقفیت اتنی زیادہ تھی
اسکول کے بعض اساتذہ کہتے تھے کہ ''پورے اسکول میں تعلیم یافتہ بچہ ایک یہی ہے''۔ اُردن
تعلیم، جامعہ اُردنیہ کے علمی ماحول اور یونیورسٹی کے پروفیسر صاحبان سے اس کی براہِ را
واقفیت کے علاوہ رات کے ۱۲ بجے تک یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھے رہنے کی وجہ سے
میں ایک حد تک پختگی آگئی تھی۔ فقہی مسائل کو سمجھنے، ان پر بحث ومناقشہ کرنے کا بھی اچھا

یدا ہوگیا تھا۔ تحقیقی مضامین لکھنے کا انداز بھی اس نے خوب سیکھ لیا تھا جس کا اندازہ اس کے
چھوڑے ہوئے فقہی مضامین سے لگایا جاسکتا ہے۔

محمد مرحوم نے فقہ واُصول کے اپنے سبجیکٹ کے علاوہ ''ٹیلیویژن میڈیا کے مبادیات، اور
دوسروں کی شخصیت کو سمجھنے کے اُصول'' وغیرہ کی ٹریننگ بھی لی تھی۔

بتدریج میں اس کے ساتھ معاملہ اپنے ایک علمی ساتھی اور زمیل کی طرح کرنے لگا تھا، اور
ذہن میں بے شمار علمی کاموں کا نقشہ صرف محمد کی ذات اور اس کی صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر میں
نے بنالیا تھا۔ خیال یہ تھا کہ میری تعلیم تو دار العلوم دیوبند میں قدیم انداز پر ہوئی ہے جس میں
بہت سی خوبیوں کے باوجود ذہن ودماغ متاخرین کی لکھی ہوئی کتابوں اور ان کے شروح وحواشی
کے گرد ہی گھومتا رہتا ہے۔ محمد کی تعلیم نئے انداز پر ہوئی ہے اور نئے منہج کے مطابق اور تحقیق و
ریسرچ کا نیا انداز بھی یونیورسٹی میں اس نے سیکھا ہے، اس لئے میرے علمی نقص کی تکمیل اس کے
ذریعہ ہوگی اور جدید فقہی مسائل پر اس کی تحریریں مجھ سے زیادہ وقیع اور وزنی ہوا کریں گی اور
مستقبل میں اللہ نے توفیق اور سہولت دی تو فقہ واُصول کی تعلیم کا مستقل نصاب تیار کرنے میں
اس کے ساتھ ملکر شاید ہم کامیاب ہوجائیں گے، بلکہ دیگر ادبی وشرعی علوم کے لئے بھی قدیم و
جدید مناہج کو سامنے رکھ کر ایک متوازن سلسلہ تیار کیا جاسکے گا لیکن

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

گھر میں عام طور پر محمد کو ''حجی'' کے عرفی نام سے ہی پکارا جاتا تھا اور اس کا پس منظر یہ
ہے کہ ۱۹۸۷ء کے حج میں جبکہ اس کی عمر بمشکل ڈیڑھ سال کی تھی اپنے ماں باپ اور دادی کے
ساتھ وہ بھی حج کے قافلہ میں شامل تھا۔ ظاہر ہے کہ ڈیڑھ سال کی عمر میں حج کیا؟ لیکن کعبہ پر نظر
بچہ کی بھی پڑتی ہی ہے، پھر منیٰ وعرفات سے اس عمر میں گزر جانا بھی تو سعادت مندی ہی کہی

جائے گی، جسمانی طور پر کمزور ہونے کے باوجود اس سفر حج میں ہم سب پر حج کا اثر نزلہ
اور بخار کی شکل میں ظاہر ہوا لیکن محمد مکمل طور پر محفوظ رہا۔ خدا کی شان یہ کہ گزشتہ سے پیوستہ
میں سعودی عرب کے وزیر حج جناب فواد عبدالسلام الفارسی کی طرف سے مجھے دعوت نامہ مو
ہوا کہ "دور الشعار الإسلامية فی بناء الحضارة الإنسانية" کے عنوان سے ایک
لکھ کر بھیجوں جو ایام حج میں منعقد ہونے والے ندوۃ الحج الکبریٰ میں پیش ہوگا اور وزارت
زیر انتظام حج کی سعادت بھی میسر ہوگی، اور اپنے ساتھ افراد خاندان میں سے کسی ایک کو
لانے کی بھی سہولت ہوگی چنانچہ قرعہ فال محمد کے نام ہی کا نکلا اور اس طرح سن رشد کو پہنچنے سے
بھی سرکاری ضیافت میں باقاعدہ حج کی سعادت اس نے حاصل کی اور ساتھ ہی سمینار اور
ثقافتی پروگراموں سے بھی بہرہ ور ہوتا رہا۔ اب بھی وکیل الوزارۃ ڈاکٹر ہشام العباس کا جب
ٹیلیفون آتا ہے تو وہ محمد کی خیریت ضرور دریافت کرتے ہیں۔ اب محمد تو اپنے رب کے حضور
گئے ہیں، دل میں حسرت اس غنچہ کی ضرور رہے گی جو بن کھلے مرجھا گیا۔ شاید اللہ تعالیٰ کسی
اس طرح کے کام کی توفیق دے گا۔

محمد کے سفر آخرت کی کہانی بھی عجیب وغریب ہے۔ ابھی چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ اس
مجھے اردن آنے کی دعوت دی کہ جارڈن یونیورسٹی میں میرا "حفل تخرج" یا "جلسہ تقسیم اسناد"
چنانچہ میں گیا، بڑا پرشکوہ اور دلفریب منظر تھا۔ جھنڈوں اور ترانوں کے ساتھ تقریب منائی
فراغت کی سندیں تقسیم کی گئیں، اساتذہ اور طلبہ سبھی مخصوص لباس اور خصوصی شعار کے ساتھ
بند ہو کر جلوہ افروز رہے۔ چند دنوں کے اس سفر میں اس نے وہاں کی اہم دینی شخصیتوں، یونیورسٹی
کے اساتذہ اور دیگر عمائدین سے ملاقاتیں کرائیں۔ رمضان المبارک کا مہینہ اس نے کویت
ہی گزارا اور شوال میں پھر اُردن جا کر قافلہ علم میں شامل ہو گیا۔ ہر دوسرے تیسرے دن ٹیلیفو

کا سلسلہ جاری رہا، ایم اے کے لیے تمہیدی کورس کی تکمیل کے ساتھ رسالہ لکھنے کا معاملہ بھی
ہو گیا، خاکہ بھی منظور کرلیا گیا، چند دنوں بعد کویت میں ہی کچھ عرصہ گزارنے کا پروگرام بن گیا
اچانک یکشنبہ کی رات میں رئیس جامعہ کا ٹیلیفون آیا کہ محمد نازک حالت میں ہے۔

یہ خبر صاعقہ اثر دل پر برق بن کر گری اور اگلے دن ہی اُردن کیلئے روانہ ہو گیا۔ اُردن پہنچنے
بعد اس کے ایک محبوب استاذ نے عمان ایر پورٹ پر ہمارا استقبال کیا اور بعجلت گاڑی میں
ر "فندق تولیدو" لے گئے۔ ہمیں بے چینی ہاسپٹل جانے کیلئے ہو رہی تھی لیکن انہوں نے
ت اثر خبر سنانے سے گریز کرتے ہوئے حکمت سے کام لینے کی کوشش کی لیکن ہوٹل پہنچتے ہی
ی کے وزیر اوقاف اور نامور فقیہ اور جدہ فقہ اکیڈمی کے سابق جنرل سیکریٹری ڈاکٹر عبدالسلام
ی اور جامعۃ العلوم الإسلامیہ کے رئیس ڈاکٹر عبدالناصر ابوالبصل نے تعزیتی کلمات کے
صبر کی تلقین کرنی شروع کی، اب نہ تو بدن میں جان رہی نہ پاؤں تلے زمین، تھوڑی ہی دیر
بعد اُردن یونیورسٹی کے ہاسپٹل کے برف خانہ میں چلتے پھرتے محمد کے بجائے اس کی لاش
تھی۔ کیا لکھوں کہ اس وقت میرا حال کیا تھا اور مرحوم کی بہن عائشہ پر کیا گزری؟ پچھلے سفر
ہی میرا دلیل راہ تھا اور اس سفر میں کہا یہ جا رہا تھا کہ محمد کو زیر زمین دفن کرنے کیلئے تمہیں
جگہ پسند ہے اُردن یا کویت؟ اللہ تعالیٰ نے یہ دن دیکھنا بھی میرے لئے مقدر کر رکھا تھا کہ
سال محمد جب علمی کاموں میں باپ کا ہاتھ بٹانے بلکہ باپ پر سبقت لیجانے کے قابل ہوا تو
ندگی کا صفحہ ہی لپیٹ دیا گیا۔

قسمت کی شومی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا

حادثہ اتنا سنگین اور ہولناک کہ ذہن و دماغ کیلئے یہ فیصلہ مشکل ہوجاتا ہے کہ آدمی جواں سال اور باکمال بیٹے کو سپرد خاک کرے یا خود زندہ درگور ہوجائے۔ یہ محض آخر زندگی پر ایمان و یقین کا کرشمہ ہے کہ آدمی تلخ سے تلخ تر گھونٹ پی جاتا ہے اور تسلیم و رضا اور احتساب کا دامن ہاتھوں سے نہیں چھوڑتا۔ ایک طرف یہ احساس کہ ماں کیلئے نہ اپنے لخت چہرہ دیکھنے کا موقع اور نہ کبھی قبر پر آکر یاد تازہ کرلینے کی ہی گنجائش۔ دوسری طرف اُردن محبین کا یہ کہنا کہ یہ جگہ بیت المقدس کے اردگرد میں آتی ہے جسے بابرکت کہا گیا ہے، متعدد کی قبریں یہاں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہیں اور یہی ارض محشر بھی ہے۔

بہرکیف جذبات پر عقل و شریعت کے تقاضے کو غالب کرتے ہوئے میں نے عمان میں تدفین کا فیصلہ کیا، پھر پوری تکریم کے ساتھ اپنے ایک نونہال کی طرح جامعہ کے ذمہ داروں خود اپنے ہاتھوں سے تدفین کی اور ہمیشہ کیلئے محمد اُردن کی زمین کا حصہ بن کر رہ گیا۔

واقعات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اُردن گیا تو تھا آخری علمی شہادت (ڈگری) لینے کے لیکن قدرت نے اس کے لئے دوسری شہادت مقدر کر رکھی تھی۔ غریب الوطنی، دین کے علم کی اور پھر ایک جان لیوا عارضہ میں موت، تینوں چیزیں شہیدوں کی صف میں اس کو شامل کر بشارت دیتی ہیں البتہ اس بات پر دل خون ہوتا ہے کہ صرف چند ماہ قبل یونیورسٹی سے فراغ سرٹیفکٹ ہمارے ہاتھوں میں آئی تھی اور ماحول خوشی و مسرت کا تھا اور آج ہاتھوں میں مو سرٹیفکٹ ہے اور سارا ماحول اداس اور ساری دنیا ماتم کدہ۔

دنیا کی بے ثباتی کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے (وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْ وَالْإِكْرَامِ)۔

حقیقت یہی ہے کہ:

آنچہ من گم کردہ ام گر از سلیماں گم شدے
ہم سلیماں، ہم پری ہم اہر من بگریستے

دنیا بھر سے مخلصین و محبین نے جس طرح محمد کی موت پر غم کا اظہار کیا ہے، مجھے تسلی دینے کی شش کی ہے اور مرحوم کیلئے دعائیں اور عمرے کئے ہیں ان سے ڈھارس بندھتی ہے کہ انشاء اللہ کے نزدیک اس کا مقام بلند ہوگا۔

محمد کی اس ناگہانی وفات کا حادثہ اس قدر جانکاہ، کرب انگیز اور اندوہناک ہے کہ جس نے رے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا ہے، زندگی میں اتنا بڑا صدمہ مجھے کبھی سہنا نہیں پڑا اور نہ اس رح کا واقعہ پیش آنے کا دور دور تک کوئی تصور تھا لیکن حقیقت یہی ہے، دنیا کی زندگی قطعی ئیدار، زوال پذیر اور فانی ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کا مدینہ ہجرت کرجانے کے بعد اور بخار کی حالت میں یہ فرمانا کہ:

"كل امرئ مصبح فی أهله والموت أدنى من شراک نعله" (ہر شخص خوش و خرم نے اہل و عیال کے درمیان دن کا آغاز کرتا ہے حالانکہ موت جس چیز کا نام ہے وہ اس کے تے کے تسمہ بھی سے زیادہ قریب ہوا کرتی ہے) کس کی موت کہاں آئے گی؟ اس کے بارے بھی قرآن کا واضح اعلان یہی ہے کہ:

﴿وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ﴾ (کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ اس کی موت کس سرزمین ع ہوگی)۔

اب محمد ہی کو دیکھئے کب اس نے سوچا تھا کہ جس اُردن کو اس نے اپنی تعلیم کیلئے پسند کیا تھا، ں سالہا سال تک پوری عزیمت کے ساتھ جاتا رہا، اب جبکہ وہاں سے آکر کویت میں اپنے کہ کی تکمیل کرنا چاہ رہا تھا وہی اُردن اس کی ناگہانی موت کی جگہ بن جائے گا، اور جس یونیورسٹی

کے در و دیوار سے وہ مانوس ہوگیا تھا اور جسکی لائبریری میں اس کے اپنے شب و روز کے لمحات گزرتے تھے اسی یونیورسٹی میں اسکی لاش لائی جائے گی، اور اسی کے احاطہ میں آخری سفر کیلئے اُسے غسل دیا جائے گا، اور اسی اُردن کی سرزمین میں وہ ہمیشہ کیلئے پیوند خاک ہو گا۔ اور ''اجل'' جس کا کام ہی ''ازل'' سے ع

چمن سے توڑنا پھولوں کو ویرانہ میں رکھ آنا ہے

وہ اپنا کام کرڈالے گی۔

عربی کا ایک شاعر کہتا ہے:

إذا ما حمام المرأ كانت ببلدة دعته إليه حاجة فيطير

جب انسان کی موت کسی شہر میں لکھی ہے تو وہاں جانے کی ضرورت پیدا ہو ہے اور وہ اُڑ کر وہاں پہنچ جاتا ہے۔

گویا اَب یہ حقیقت کھلی ہے کہ اُردن میں ہی اعلیٰ تعلیم کے حصول پر محمد کے اصرار کے قدرت کا یہ فیصلہ بھی تھا کہ اسکی موت اُردن میں ہی آئے گی۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ اس نے اپنے باپ کو تقسیم اسناد کے جشن میں شرکت کی دی تھی، خوشی منائی تھی یادگار تصویر کھنچوائی تھی اور وہی باپ اپنی تمام امیدوں پر پانی پھیر کر تمام خوابوں کو چکنا چور کر کے، خود اسی بیٹے کی لاش کو سامنے رکھ کر جنازہ کی نماز پڑھتا ہے، کبریائی کا نعرہ بلند کرتا ہے اور خود اپنے ہی ہاتھوں سے اس کے پاک و معصوم جسم کو قبر کر ﴿ مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ، وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرىٰ ﴾ کہتے ہو کو زیر زمین روپوش کرتا ہے، اس کو اپنی نظروں سے اوجھل کرتا ہے، اور شکستہ دل اور آنکھوں کے ساتھ صبر و احتساب کی کوشش کرتا ہے اور اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش کرتا

کی جدائی المناک سہی، کربناک سہی دائمی نہیں عارضی ہے قیامت آئے گی، جنت میں انشاء اللہ اس سے ملاقات ہوگی اور ذریت کو ماں باپ سے ملادینے کا خدائی وعدہ پورا ہوگا۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

صحیح ہے: ع

زمانہ جام بکف و جنازہ بردوش است

المناک حادثہ کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ آنکھیں بہنے لگتی ہیں اور نیند اُڑ جاتی ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے بارے میں جب بعض بد باطنوں نے بے بنیاد افواہ پھیلانے کی کوشش کی اور وہ اس سے قطعی غافل تھیں ام مسطح نے انکو رات کے وقت اس کی خبر دی تو ان پر رنج و غم اور تشویش و اضطراب کی جو کیفیت طاری ہوئی اس کی تعبیر خود ہی انہوں نے بڑی بلاغت سے کی ہے، اس بیان کا ایک جملہ یہ بھی ہے کہ کئی روز و شب گزر گئے اور حال یہ تھا کہ:

"لا يرقا لي دمع ولا اكتحل بنوم" (نہ تو میرے آنسو تھم رہے تھے اور نہ نیند ہی آتی تھی)

کیا کہوں کہ جس وقت یہ خبر یقینی ہوگئی کہ محمد جو ایک یا دو دنوں میں میرے پاس کویت آنے کی تیاریوں میں تھا اب اس دنیا میں نہیں رہا اب وہ مجھ سے گفتگو نہیں کرسکتا اور نہ اپنے مخصوص لہجے میں اور ظرافت و ذہانت پر مبنی جملوں کے ذریعہ مجھے اپنی کامیابیوں پر مبارکباد دے سکتا ہے نہ اپنے آنے کی تاریخ اور مقالہ لکھنے کا پروگرام ہی بتا سکتا ہے۔ اس خبر کے یقینی ہوجانے کے بعد میری حالت وہی ہوگئی کہ:

"لا يرقا لي دمع ولا اكتحل بنوم" (نہ آنسو تھمتے تھے اور نہ نیند ہی آتی تھی)

اور اب جبکہ کئی دن ہوگئے ہیں ہوائی جہاز پر بیٹھتے ہی اس کا خیال آیا اور آنسو جاری ہوگئے،

اور ہندوستان آنے کے بعد پٹنہ اور دہلی کے درمیان کی آدھی مسافت اسی طرح طے ہوئی کہ

بیٹھے ہی بیٹھے آ گیا نہ جانے کیا خیال
پہروں لپٹ کے روئے دلِ ناتواں سے ہم

محمد میری آنکھوں کی ٹھنڈک تھا، رب کریم کا عطیہ تھا، شکوے کے الفاظ زبان پر لانے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں ''إن للّٰه ما أعطى وله ما أخذ وكل شئ عنده بمقدار'' لیکن انسان بھی تو ہوں، غم کا طاری ہونا طبعی ہے، کلیم عاجز کی زبان میں اگر حال پوچھنے والوں سے کہوں کہ:

کیا حال بیاں کیجیے، سب حال ہے آئینہ
اشکوں سے بھرا دامن، زخموں سے بھرا سینہ
وہ انجمن آرائی، یہ غربت و تنہائی
بخشا تو بہت بخشا، چھینا تو بہت چھینا

تو اسکی بھی ہمت نہیں ہوتی مومن کا کام تو صرف برداشت وخود سپردگی ہی ہے۔ إنا للّٰه وإنا إليه راجعون۔

زیادہ سے زیادہ جدائی وفراق کے غم کا اظہار کرسکتا ہے پھر سوچو تو سہی یہ جدائی اور کیسی جدائی؟ یہ فراق اور کیسا فراق؟ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْياً مَّنْسِيّاً۔

لیکن مرضی تو مولائے کریم کی ہی چلے گی، خود اپنا مرجانا یا بے نام ونشان ہوجانا بھی تو اپنے اختیار میں نہیں ہے۔

تمنا تو یہ تھی کہ میں اس دنیا سے چلا جاؤں گا تو محمد میرا ذکر خیر کرے گا، میری موت پر غم کا اظہار کرے گا اور ولد صالح ہونے کی حیثیت سے میرے لئے دعا کرے گا اور میرے نامہ اعمال

میں اضافہ کا ذریعہ بنتا رہے گا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: أو ولد صالح يدعو له کا سچا مصداق ہوگا۔

لیکن ہو یہ رہا ہے کہ میں اس کے غم سے نڈھال ہوں، میں اس کا ذکر خیر کر رہا ہوں، میں ہی اس کی جدائی پر غم کا اظہار کر رہا ہوں اور میں ہی برزخ اور آخرت میں اس کی راحت کے لئے دعا کر رہا ہوں اور اپنے لئے اسے ذخیرہ آخرت بننے کا لولگائے بیٹھا ہوں۔

رب کائنات حاکم ہے اور حکیم بھی، غفور بھی ہے اور رحیم بھی بندہ کا کام اس حقیقت پر ایمان رکھنا، اس کے ہر فعل کو حکمت پر مبنی جاننا، وہ کام کرنا جس سے وہ راضی ہو اور وہ جو کام بھی کرے اس پر خود راضی رہنا اسی میں امتحان بھی ہے، آزمائش بھی ہے اور عطاء وبخشش بھی ہے۔

عموماً ذہین لوگوں میں مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے، خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مزاح فرمایا کرتے تھے۔ آپ کے لطیف مزاح کی متعدد مثالیں حدیث کی کتابوں میں آپؐ کے شمائل کے ضمن میں ذکر گئی ہیں۔ انسان کا خوش مزاج ہونا اور جملوں کے اُلٹ پھیر سے ایسی بات پیدا کرنا جس سے لوگوں کو ہنسی آجائے زہد وتقویٰ کے منافی نہیں ہے۔

محمد (مرحوم) کو بھی لطیفہ گوئی اور خاص طور پر مصری صعیدیوں کے بارے میں دل خوش کن لطیفے اور قصے بیان کرنے کا بڑا سلیقہ تھا۔ ایک مصری صعیدی کو دیکھ کر کہنے لگا کہ:

"صعيدى سقط من الطائرة فانكسر خاطره"

(ایک صعیدی ہوائی جہاز سے گرا تو اس کی دل شکنی ہوئی (یعنی صعیدی اتنے سخت جان ہوتے ہیں کہ ہوائی جہاز سے گرنے کے بعد بھی انکو کوئی چوٹ نہیں آتی صرف خاطر شکنی ہوتی ہے)

ایک اور صعیدی سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا اوپر جا رہا تھا تو کسی نے سوال کیا کہ کہاں جا رہے ہو؟

تو وہ کہنے لگا کہ:

"عندی دراسات عُلیا" (یعنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے اوپر جارہا ہوں)

یعنی صعیدی کی سمجھ اتنی ہی ہوتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا مطلب اوپر جا کر تعلیم حاصل کرنا سمجھتا ہے۔

ایک اور صعیدی زمین میں گڑھا کھودنے میں مصروف تھا کسی نے پوچھا کہ کیا کر رہے کہنے لگا کہ:

"أنا أفكر بعمق" (میں گہرائی سے سوچتا ہوں) یعنی گہرائی سے کسی مسئلہ پر سوچنے کا مفہوم اس کے یہاں یہ ہے کہ گڈھا کھود کر آدمی غور وفکر کرے۔

اسی طرح اُردن میں عام طور پر ناموں کے اٹک کے طور پر بطائنہ، حمارنہ، خصاونہ وغیرہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان سبھوں کو جوڑ کر بھی لطیفہ بیان کرنے میں اسے بڑی مہارت تھی کا اظہار بے تکلف دوستوں کی مجلس میں ہوا کرتا تھا۔

محمد کی اس طرح کی باتیں جب یاد آتی ہیں تو عربی کی مشہور مرثیہ گو شاعرہ حضرت خنسا اشعار یاد آتے ہیں جو انہوں نے اپنے بھائی صخر کے مرثیہ میں کہے ہیں اور خود بھی روئی ساری دنیا کو صدیوں سے رُلاتی آئی ہیں۔

ألا يا صخر إن أبكيت عيني	اے صخر اگر تو نے ابھی میری آنکھیں
لقد أضحكتني زمنا طويلا	کی ہیں تو ایک طویل عرصہ تک تم نے ہنسایا بھی تو ہے
إذا قبح البكاء على قتيل	اگر کسی مقتول پر رونا نامناسب بھی ہو
وجدت بكاء ك الحسن الجميلا	رونے کو تو میں نے بہتر ہی پایا ہے

اسلام سے پہلے انہوں نے اپنے بھائی پر آنسو بہاتے ہوئے جو مرثیے کہے ہیں وہ آج بھی عربی اَدب میں مرثیہ گوئی کا اعلیٰ نمونہ سمجھے جاتے ہیں، اور جن کو پڑھ کر بے ساختہ آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں۔

آخر انکے اس طرح کے اشعار کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟

يذكرني طلوع الشمس صخرا	ہر دن آفتاب کا طلوع ہونا ہمیں صخر کی یاد
واذكره لكل غروب شمس	دلاتا ہے اور پھر آفتاب کے غروب پر بھی اسی کی یاد ستاتی رہتی ہے
ولولا كثرة الباكين حولي	اگر میرے گرد میری ہی طرح اپنے اپنے
على إخوانهم لقتلت نفسي	بھائیوں پر رونے والوں کی کثرت نہ ہوتی تو میں اپنے آپ کو ہی ہلاک کر لیتی
وما يبكون مثل أخي ولكن	ان رونے والوں کے بھائی میرے بھائی کے
أعزي النفس عنه بالتأسي	پایہ کے تو نہیں تھے لیکن انکی اتباع کر کے اپنے نفس کو تسکین دلانے کی کوشش کرتی ہوں
فو الهفا عليه ولهف نفسي	پس افسوس جانے والے پر ہائے افسوس
أيصبح في الضريح وفيه يمسي	اپنی بے بسی پر کیا اَب میرے بھائی کی صبح وشام قبر میں ہی گزرے گی؟

لیکن یہی خنساءؓ جب ایمان کی دولت سے مشرف ہوئیں اور ایمان انکی رگ وپے میں سرایت کر گیا تو جنگ قادسیہ میں انہوں نے اپنے چار بیٹوں کی شہادت پر اللہ کا شکر ادا کیا اور انکے بارے میں پھر کوئی ایسا مرثیہ بھی نہیں کہا جس کا ذکر تاریخ وادب کی کتابوں میں ملتا ہو۔

کسی قریبی عزیز کی موت پر رونا یا آنکھوں کا اشکبار ہو جانا تو فطرت انسانی کا تقاضا ہے لیکن مؤمن کا ایمان اسے دائمی ماتم اور ہمہ وقتی سوگ منانے کے بجائے اللہ کی رحمت پر یقین، اللہ کی حکمت پر بھروسہ اور آخرت میں اسکی عطا وبخشش کی امید دلا کر اس کے غم کو ہلکا کرتا اور اسے صبر وشکیب سے کام لینے پر ابھارتا ہے۔

بکی جزعا لفقدان الحبیب
واسبل دمع ملهوف كئيب

محبوب ذات کے کھونے پر شدت اور گھبراہٹ کے ساتھ رویا، اور غمزدہ اور مصیبت کے مارے شخص کی طرح آنسو بہانے لگا،

وكان الصبر أجمل لو تعزّى
و أشفى للصدور من النحيب

جبکہ صبر کرنا غم ہلکا کرنے کیلئے زیادہ موزوں اور دل کی تسکین کیلئے آہ وبکا کے مقابلہ میں زیادہ بہتر تھا)

مومن کا ایمان اسے یہ یقین دلاتا ہے کہ:

﴿قُل لَّن يُصِيبَنَآ إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا هُوَ مَوْلَىٰنَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ﴾ (سورہ توبہ : ۵۱)۔

(آپ کہہ دیجئے کہ ہمیں اتنی ہی مصیبت لاحق ہوسکتی ہے جو اللہ نے پہلے سے لکھ رکھی ہے، وہی ہمارا آقا ہے، اور ایمان والوں کو اللہ کی ذات پر ہی بھروسہ کرنا چاہئے)۔

اس لئے آہ وبکا، گریہ وزاری اور جزع فزع کرنے کے بجائے صبر واحتساب کی راہ اختیار کرنی چاہئے اور یہ امید رکھنی چاہئے کہ جانے والے سے جدائی کتنی ہی جاں گسل سہی دائمی نہیں ہے۔ اللہ کی رحمت اگر شامل حال رہی تو جنت میں ملاقات ہوگی، عائلی ماحول ہوگا، رب کائنات

کی رحمتیں ہوں گی اور نہ ختم ہونے والی زندگی اور زندگی کی نعمتیں، راحتیں اور لذتیں ہوں گی لہذا انکے حصول کیلئے انسان کو کوشاں رہنا چاہئے۔

خوشی وشادمانی کی طرح غم والم بھی انسان کی زندگی کا خاصہ ہے، مومن کی زندگی بھی ابتلاء وآزمائش اور غم والم سے اسی طرح دوچار ہوتی ہے جس طرح کہ غیر مومن کی، فرق یہ ہے کہ مومن اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتا ہے اور اس کی طرف سے آنے والی آزمائش پر صبر کرتا ہے تو دونوں ہی اس کے حق میں خیر ہوتے ہیں اور اس کے لئے آخرت کی راحت وسعادت کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔

صحیح مسلم کے اندر حضرت اُمّ سلمہؓ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ:

"ما من عبد تصيبه مصيبة فيقول إنا لله وإنا إليه راجعون، اللّٰهم أجرني في مصيبتي واخلف لي خيرا منها إلا آجره الله في مصيبة واخلف له خيرا منها".

(جب کسی بندہ کو مصیبت لاحق ہوتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ ہم اللہ ہی کیلئے ہیں اور ہم سب اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، اے اللہ اس مصیبت سے ہمیں اپنی پناہ میں لے لیجئے اور ہمارا جو نقصان ہوا ہے اس کا اس سے بہتر بدل عطا فرمائیے تو اللہ تعالیٰ مصیبت میں اسکی مدد کرتا ہے اور اس سے بہتر بدل عطا فرماتا ہے)

امام احمدؒ نے اپنی مسند میں ابوموسیٰ اشعریؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

"إذا قبض ولد العبد يقول الله عزوجل لملائكته: أقبضتم ولد

عبدی؟ فیقولون: نعم ۔ فیقول: أقبضتم ثمرة فؤاده؟ فیقولون: نعم ۔ فیقول: ماذا قال عبدی؟ فیقولون: حمدک واسترجعک ۔ فیقول: ابنوا لعبدی بیتا فی الجنة وسمّوه بیت الحمد"۔

(جب کسی بندہ کے بیٹے کی روح قبض کرلی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ: کیا تم لوگوں نے میرے بندہ کے بیٹے کی روح قبض کرلی ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ: ہاں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کیا تم لوگوں نے اس کے جگر کے ٹکڑے کی روح قبض کرلی ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ: ہاں۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: پھر میرے بندے نے کیا کہا؟ تو وہ کہتے ہیں: اس نے آپ کی حمد بیان کی اور إنا للہ وإنا إلیہ راجعون کہا۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم میرے بندہ کیلئے جنت میں ایک گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو)

موت کی تباہ کاری تو ہر زمانہ ہی میں رہی ہے۔ ۶۹ھ میں جبکہ حضرت عبداللہ بن الز کا عہد اقتدار تھا طاعون پھیل جانے کی وجہ سے ایک ایک دن میں ۷۰ ہزار سے زائد ا ہلاک ہوتے رہے۔ عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے چالیس بیٹے اور حضرت أنس بن مالکؓ کے سے زائد بیٹے اس طاعون کے دوران ہلاک ہوگئے اس کے باوجود انکے صبر واستقامت کوئی فرق نہیں آیا۔

سنن نسائی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک صحابیؓ کے مجلس میں نہ آنے کی جب آپؐ کو یہ بتلائی گئی کہ انکے بیٹے کا انتقال ہوگیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکو کہا کہ:

"یا فلان، أیما کان أحب إلیک أن تمتع عمرک، أو تأتی غدا بابا

من أبواب الجنة إلا وجدته قد سبقک إلیه یفتحه لک؟ قال: یا نبی اللّٰه بل یسبقنی إلی الجنة فیفتحها لی هو أحب إلیّ۔ قال: فذلک لک"۔ (رواہ النسائی)

(اچھا تم یہ تو بتاؤ کہ تمہارے لئے کونسی بات زیادہ پسندیدہ تھی یہ کہ وہ زندہ رہے اور تم اسکی زندگی سے فائدہ اٹھاتے رہو یا یہ بہتر ہے کہ تم جب کل کے دن جنت کے کسی دروازے پر آؤ تو وہ پہلے ہی وہاں پہنچا ہوا ملے اور تمہارے لئے جنت کا دروازہ کھولے؟ تو انہوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے بات یہی زیادہ پسند ہے کہ وہ مجھ سے پہلے ہی جنت میں پہنچا ہوا ہو اور میرے لئے دروازہ کھولے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پھر یہ تو تمہارے لئے طے شدہ ہے)۔

مجھ جیسا ایک غمزدہ انسان اللہ رب العزت سے یہی دعا کرتا ہے کہ جانے والے کو اپنی رحمت مغفرت سے نوازے، اور باقی رہ جانے والوں کو اس اجر سے بہرہ ور کرے جسکی بشارت نبی رحم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ وما ذلک علی اللّٰه بعزیز

یا ربّ إنی أشهدک علی أننی قد صبرت منذ الصدمة الأولی بوفاة محمد، واحتسبت محمدا عندک، فأکرم نُزُله، ووسّع مدخله، واغفرله واجعله ذُخراً لی ولأهلی۔ اللّٰهم لا تفتنّا بعده، ولا تحرمنا أجره، إنک أنت الغفورُ الوهّاب۔

(بارالہا تو گواہ ہے کہ محمد کی وفات سے لاحق ہونے والے زبردست صدمہ پر میں نے شروع سے ہی صبر کرنے کی کوشش کی ہے اور محمد کو تیرے پاس توشۂ آخرت

تصور کیا ہے، لہذا تجھی سے درخواست ہے کہ تو اس کے ساتھ حسن استقبال کا معا
فرما، اسکی قبر کو کشادہ فرمادے اور اسے میرے اور میرے اہل خانہ کیلئے ذخیر
آخرت بنا، اور اس کے بعد ہمیں نہ تو فتنہ میں مبتلا کر اور نہ اس کے اجر سے محروم فر
بیشک تیری ذات ہی بخشنے والی اور نوازنے والی ہے)

❁❁❁

والدہ محترمہ کی وفات کا سانحہ

بدرالحسن القاسمی

آہ..... ماہ صفر ۱۴۳۱ھ کی ۲۵ تاریخ مطابق ۹ر فروری ۲۰۱۰ء بروز منگل طلوع فجر کے بعد
ہ محترمہ بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں اور کئی سال کی علالت اور معذوری و مجبوری کے بعد
ں سوگوار چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوگئیں إنا للہ وإنا إلیہ راجعون۔

یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ اَب سے صرف ایک ہفتہ پہلے ۲ر فروری کو اور ٹھیک منگل کے
ی اُردن کے دار الحکومت عمان میں اپنے جواں سال تعلیم یافتہ بیٹے ''محمد'' کی تدفین کی تھی
ج ایک ہفتہ بعد اپنی والدہ کو سپرد خاک کر رہا ہوں، کاش کہ ان اندوہناک اور صبر آزما
ت کو دیکھنے سے پہلے میں خود ہی نہ ہوتا، تو اس قدر بار غم اٹھانے کی نوبت نہ آتی وَلٰکِنْ
مرُ اللّٰہِ قَدَراً مَّقْدُوْراً۔

الدہ کی ذات ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے کیونکہ والدہ سے بڑھکر اپنے بچوں کی خاطر مشقت
والی اور ان سے محبت کرنے والی ذات کوئی اور نہیں ہوتی۔ باپ کا درجہ بھی ''ماں'' کے بعد
ہے چنانچہ کمال رحمت و شفقت کی مثال میں ''ماں'' اور پھر ''باپ'' کا ہی ذکر کیا جاتا ہے۔
ر الشعراء شوقیؒ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت اور اپنی اُمت کے ساتھ بلکہ ساری
اور کائنات کے ساتھ آپؐ کے جذبۂ شفقت کی مثال تلاش کرنی چاہی تو انکو بھی رحمت کے
م کی مثال ماں اور باپ کے علاوہ کچھ اور نہیں ملی۔

چنانچہ اپنے مشہور نعتیہ قصیدہ میں حضورؐ کی شان رحمت کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

و إذا رحمت فأنت أم أو أب
هذان في الدنيا هما الرحماء

جب آپ رحم لی پر آتے ہیں تو آپکی مثال ''ماں'' یا ''باپ'' کی ہوتی ہے کیونکہ اس دنیا میں رحمت وشفقت کا مظہر کامل یہی دونوں ہیں۔

والدہ مرحومہ میرے لئے ماں اور باپ دونوں ہی کی حیثیت رکھتی تھیں کیونکہ والد کے سایہ عاطفت سے اپنی زندگی کے بالکل ابتدائی سالوں میں ہی محروم ہوگیا تھا، ایک عرصہ تک انکے زندہ سلامت رہنے کے باوجود ہم اپنی بہن اور والدہ کے ساتھ نانیہال میں زندگی گزارتے رہے اور نانا کا سایۂ عاطفت ہمارے لئے والد کے سایہ سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ دادیہال کو تو ہم سرے سے بھول ہی چکے تھے۔ اپنے تعلیمی مراحل کی تکمیل بھی میں نے اسی حال میں کی اور شاید ربّ کریم کی مصلحت بھی اسی میں تھی کیونکہ اگر میں دادیہال میں رہ جاتا تو اِردگرد کے ماحول کو دیکھ کر خیال یہی ہوتا ہے کہ تعلیمی راہ پر چلنا شاید آسان نہ ہوتا۔

میری عمر بمشکل ۳؍سال کی ہوگی کہ غروب آفتاب سے کچھ پہلے مجھے اپنی والدہ اور عمر میں مجھ سے بڑی ایک بہن کے ساتھ دادیہال ترک کرکے نانا کے گاؤں منتقل ہونا پڑا تھا، مقصد میری والدہ کی دادرسی تھی جو اپنی خوش دامن کی ناخوش مزاجی سے تنگ آچکی تھیں، نانا جان بڑے غیور اور جسمانی طور پر طاقتور انسان واقع ہوئے تھے۔ علاقہ میں انکی بڑی شہرت تھی۔ وہ کب گوارا کرسکتے تھے کہ انکی بیٹی مظلوم ومغلوب بن کر زندگی گزارے، سسرال میں اپنی بیٹی کی حالت دیکھ کر انکی غیرت جوش میں آئی اور انہوں نے ہمیشہ کیلئے ہمیں اس شکنجہ سے نکال لیا اور پوری شان وبان سے ہمیں پال پوس کر بڑا کیا۔

ہندوستانی مسلم معاشرہ میں ساس بہو کی آویزش کی داستانیں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہیں۔ نہ جانے کتنے ہی خاندان ہیں جو اس آویزش کی نذر ہوگئے اور ان کا سکون ہمیشہ کیلئے غارت ہوکر رہ گیا۔

میری دادی کا رویہ والدہ کے ساتھ بہرحال ایسا نہیں تھا جس کا وہ تحمل کرسکتیں، میرے نانا چونکہ اسکی قدرت رکھتے تھے کہ ہم لوگوں کی کفالت کرسکیں اس لئے انہوں نے ہمیں نانیہال میں ہی آباد کرلیا اور پھر اسے تمام زندگی نباہتے رہے، اور ماموں صاحبان نے بھی اسے خوش دلی سے گوارا کیا۔ بہرکیف ہندوستان میں مسلم معاشرہ کی ناہمواریاں ایسی ہیں جن سے خواتین کو سخت کٹھنائیوں سے گزرنا پڑتا ہے، اور اکثر وبیشتر وہ ظلم وستم کا نشانہ بنتی رہتی ہیں۔ آئے دن ایسے روح فرسا واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ شادی کے بعد نئی نویلی دلہن کی خوشی وسعادت کے لمحات مختصر ہوجاتے ہیں اور تھوڑا ہی عرصہ گزرنے کے بعد یا تو وہ شوہر کی محبت وموڈت کے بجائے حرص وآز کا شکار ہوکر زندگی تک سے ہاتھ دُھونے پر مجبور ہوجاتی ہے یا پھر ساس، نند اور شوہر تینوں کی طرف سے ذہنی اذیت اور کوفت کو سہ کر محرومی وشقاوت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے، اور طرح طرح کی نفسیاتی وجسمانی بیماریاں لاحق ہونے لگتی ہیں، اس صورت حال کی اصلاح کیلئے داعیان دین بھی زیادہ متوجہ نظر نہیں آتے۔

والدہ محترمہ کا ساری زندگی میکہ میں گزار دینا بھی اسی طرح کے معاشرتی بگاڑ کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے، گوکہ ان کا میکہ انکے حق میں سسرال سے بہتر تھا۔

لیکن عام انسانی معاشرہ اور طبعی نظام تو یہی ہے کہ ماں باپ کا گھر چھوڑ کر ازدواجی رشتہ کے بعد ایک اور گھر بسایا جائے۔ اللہ کے فضل سے والدہ محترمہ کو زندگی کے کسی مرحلہ میں کسی طرح کی مالی تنگی یا ظاہری وجسمانی تکلیف کا سامنا کرنا نہیں پڑا اور میکہ میں بھی وہ پورے دبدبہ کے ساتھ

رہیں لیکن رشتہ قائم رہنے کے باوجود ساری زندگی میکہ میں گزار دینا اور اپنے سسرالی حقوق سے محروم رہنا خود ہی ایک دائمی نفسیاتی اذیت اور ذہنی غیر آسودگی کا باعث ہوتا ہے جس کا اثر انکے مزاج، قوت تحمل اور پھر آخر عمر میں ذہنی وجسمانی صحت پر غیر معمولی ہوا اور اپنی عمر سے زیادہ کمزور آنے لگیں، اور آخری دنوں میں تو شناخت اور یادداشت پر بھی بہت زیادہ اثر ظاہر ہونے لگا تھا۔ اور جب اجل موعود آیا تو بالکل صاحب فراش ہو چکی تھیں، کھانا پینا بھی بڑی حد تک موقوف ہو چکا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ انکی زندگی بعض لحاظ سے بڑی کٹھن تھی، انہوں نے ساس کے جور وستم یا سسرالی ماحول کی ناہمواری کی وجہ سے ساری زندگی ایک طرح کی ذہنی اذیت میں گزاری اسلئے بجا طور پر وہ کہہ سکتی تھیں کہ

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
ہم نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

نانا نانی کا تصور عام طور پر دادا دادی کے مقابلہ میں ثانوی درجہ کے رشتہ داروں کا ہوتا ہے۔ میراث کے بعض ماہرین نے تو میراث میں استحقاق کو سامنے رکھ کر نانا کیلئے "جدّ فاسد" کی اصطلاح گھڑلی ہے جسکی کوئی شرعی بنیاد نہیں معلوم ہوتی۔ عورت کے ذریعہ نسبت میں ہونے میں "فساد" کیا ہے؟ آخر حسنؓ وحسینؓ کا رشتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت فاطمۃ الزہراءؓ کے ذریعہ اور واسطہ سے ہی تو تھا جہاں اس طرح کی فاسد تعبیر کا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا۔

بہر حال میرے لئے بھی نانا جان کی ذات فرشتۂ رحمت سے کم نہ تھی وہ میرے نانا ضرور تھے لیکن "جدّ صحیح" سے بھی بڑھکر تھے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ انہوں نے جس شفقت ومحبت کے ساتھ ہم لوگوں کی پرورش کی پھر جس طرح ہماری تعلیم وتربیت

کا خیال رکھا وہ یقیناً انکے لئے صدقہ جاریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

گاؤں دیہات میں گو کہ علم کی روشنی اب پھیلتی جارہی ہے لیکن پہلے ایسی صورت حال نہ تھی، اور گاؤں کے بے شمار بچے مدرسہ یا اسکول کی راہ اختیار کرنے کے بجائے شروع سے ہی کاشتکاری کے مشغلہ میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹانے لگتے ہیں یا مویشی پالنے کے کام میں لگ جایا کرتے ہیں، اس طرح کے ماحول میں علم کا حصول آسان نہیں ہوتا۔

حافظ ابن حزم ظاہری اور نامور مالکی فقیہ ومحدّث علامہ ابو الولید الباجیؒ دونوں ہم عصر علماء گزرے ہیں اور معاصرانہ چشمک کبھی کبھی ان دونوں کے درمیان جب ظاہر ہوتی تو یہ دلچسپ بحث سامنے آتی کہ آدمی کا فقر وفاقہ کی زندگی میں علم حاصل کر لینا زیادہ بڑا کمال ہے یا ناز ونعمت کی زندگی گزارنے کے باوجود علمی کمال کی طرف توجہ رکھنا زیادہ قابل ستائش ہے۔

علامہ ابو الولید الباجیؒ کہتے کہ تم کو تو مادی وسائل بے پناہ حاصل تھے، مال ودولت کی ریل پیل تھی پھر تمہارا علم کی طرف متوجہ ہونا کونسا کمال ہے؟ مجھے دیکھو کہ میں دانہ دانہ کا محتاج تھا کسی طرح کا کوئی مادی وسیلہ میرے پاس نہیں تھا اس کے باوجود میں نے محنت ولگن سے پڑھا اور مختلف علوم میں امامت کا درجہ مجھے حاصل ہوا۔

اس کے جواب میں علامہ ابن حزم کہتے کہ فقیری حصول علم کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہے بلکہ مال ودولت کی ریل پیل، عیش وعشرت کا ماحول، شاہی محل میں باندیوں کی کثرت اور مختلف طرح کی مادی لذتوں میں پھنس جانے کے خطرات کے باوجود مجھے دیکھو کہ میں نے کس طرح دل لبھانے اور ذہن کو پراگندہ کرنے والے ماحول میں رہنے کے باوجود اپنے آپ پر قابو رکھا اور علم دین کے حصول میں لگا رہا اور کمال حاصل کر کے ہی چھوڑا۔

عزیزوں اور خاص طور پر ایسے عزیزوں کا فراق جنکی زندگی میں دل کی زندگی اور روح کیلئے

تازگی اور نشاط کا سامان ہو نفس پر انتہائی شاق اور گراں گزرتا ہے جسکی تلخی کو انگیز کر جانا بڑی اُولو العزمی کا کام ہے۔

لو ذاق طعم الفراق رضوی	اگر رضوی پہاڑ کو بھی فراق کا غم برداشت کرنا
لکاد من وجوده یمید	پڑتا تو شدت غم سے وہ پگھلنے لگتا
قد حملونی عذاب شوق	جانے والوں نے ہم پر شوق کا ایسا بار گراں
یعجز عن حمله الحدید	ڈالا ہے کہ جنکو اٹھانے سے لوہے بھی اپنی
	صلابت کے باوجود عاجز ہیں۔

دین کا نقصان دنیوی نقصان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ دارمی کی روایت کے مطابق خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلقین فرمائی ہے کہ:

"إذا أصاب أحدكم مصيبة فليذكر مصابه بي فإنها أعظم المصائب"

(اگر تم میں سے کسی کو کوئی مصیبت لاحق ہو جائے تو میرے حادثۂ وفات کو یاد کرے کیونکہ وہ تمام مصیبتوں سے بڑھکر ہے)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے بڑا نقصان اور کیا ہو سکتا ہے؟ حضرت اُم اَیمنؓ کے "بقول آسمان وزمین کے درمیان وحی کا رشتہ منقطع ہو گیا" اور حضرت اَنسؓ کے کہنے کے مطابق جس دن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تھے تو مدینہ کی ہر چیز روشن ہو گئی تھی اور جس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا سانحہ پیش آیا ہے اُس دن وہاں کی ہر چیز تاریک ہو گئی، اور جب حضورؐ کی تدفین سے ہم فارغ ہوئے تو ہمارے دلوں کی حالت ہی بدلی ہوئی محسوس ہونے لگی"۔

غم کا اثر کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں حضرت عثمانؓ کا بیان ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حادثۂ وفات پیش آیا تو میں مدینہ کے ایک ٹیلہ پر بیٹھا ہوا تھا اس وقت حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کیلئے بیعت لی جا چکی تھی حضرت عمرؓ کا گزر ہوا تو انہوں نے مجھے سلام کیا۔

فسلّم علیّ عمر فلم أشعر به لما بی من الحزن۔

(حضرت عمرؓ نے مجھے سلام کیا تو شدت حزن کی وجہ سے مجھے محسوس ہی نہیں ہوا کہ انہوں نے مجھے سلام کیا ہے)

حافظ ابن رجب کا بیان ہے کہ:

و لما توفّی صلی اللّٰه علیه وسلم اضطرب المسلمون فمنهم من دهش فخولط ومنهم من أقعد فلم یطق القیام ومنهم من اعتقل لسانه فلم یطق الکلام ومنهم من أنکر موته بالکلیة۔ (لطائف المعارف)

(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا جب وصال ہوا تو مسلمانوں میں عجیب طرح کی دہشت پھیل گئی۔ بعض پر شدت غم کی وجہ سے جنون کی سی کیفیت طاری ہو گئی، کوئی حادثہ کی ہولناکی کی وجہ سے بیٹھا ہی رہ گیا کھڑے ہونے کی اسمیں تاب ہی نہ رہی، اور بعض نے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کا ہی انکار کر دیا)

جب صحابہ کرامؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین سے فارغ ہو گئے تو حضرت فاطمہؓ نے حضرت اَنسؓ سے خطاب کر کے نہایت ہی معصومیت کے ساتھ دریافت کیا:

کیف طابت أنفسکم أن تحثوا علی رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم التراب؟

(آپ لوگوں کو یہ بات کس طرح گوارا ہوئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد

اطہر کے اوپر مٹی ڈالیں؟)

اس سوال کا جواب حضرت اُنسؓ کے یا کسی اور کے پاس ہو بھی کیا سکتا تھا؟

''قبر'' کا لفظ ہی ہولناک ہے اور اس کا تصور انتہائی پریشان کن، حضرت عثمان غنیؓ قبر کا ذکر کر کے اتنا روتے تھے کہ ڈاڑھی تر ہو جایا کرتی تھی۔ کسی نے دریافت کیا کہ جنت و دوزخ اور دوسری اور کسی چیز کے ذکر پر آپ اتنا نہیں روتے جتنا قبر کے ذکر پر روتے ہیں تو فرمانے لگے کہ:

''آخرت کی پہلی منزل قبر ہی ہے، اس کا معاملہ آسان ہو تو بعد کے مراحل بھی آسان ہو جائیں گے''۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''قبر'' کو

روضة من رياض الجنة اور حفرة من حفر النار (جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا) قرار دیا ہے۔

ایک شخص کہتا ہے کہ:

فارقت موضع مرقدی	ایک رات میں نے اپنے سونے کی جگہ چھوڑ
يوما ففارقني السكون	دی اور دوسری جگہ سونا چاہا تو سکون نہیں ملا اور بے خوابی رہی
في القبر أوّل ليلة	پھر بتاؤ تو سہی کہ قبر میں پہلی رات کس طرح
بالله قل لي ما يكون	گزرے گی؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کو یاد کرتے رہنے کی تلقین فرمائی ہے:

اكثروا ذكرها ذم اللذات۔

(لذتوں کو پاش پاش کر دینے والی چیز یعنی موت کو کثرت سے یاد کرتے رہا کرو)

زبان سے ''قبر'' کے بارے میں اس طرح کی باتیں کہتے رہنے کا موقع تو وعظ و ارشاد کے دوران بار بار پیش آتا رہا ہے لیکن عملی طور پر قبر میں اُتر کر کسی میت کو دفنانے کا یہ پہلا موقع تھا۔

چند ہی دن پہلے اپنے لختِ جگر ''محمد'' کو عثمان کے ایک مقبرہ میں سپرد خاک کر کے آیا تھا جہاں میں قبر کے کنارے بیٹھ کر اپنے چاند کو ڈوبتا ہوا دیکھتا رہا کہ وہی وجود جسے کبھی اپنے کندھے پر اٹھاتا، سینے پر چڑھاتا پھر بڑے ہونے کے بعد جس کی باتوں سے اُنس ہوتا، جو کبھی نئی کتابوں اور نئے موضوعات سے ہمیں آگاہ کرتا تھا، سفر سے آ کر کبھی اپنے اساتذہ کے دلچسپ واقعات سناتا، محبت سے میری پیشانی چومتا آج اسے زیرِ زمین دفن کر رہا ہوں یا اپنی امانت ربِّ کریم کے سپرد کر رہا ہوں جس کے پاس امانتیں ضائع نہیں ہوا کرتیں۔

خیر ذکر تو والدہ محترمہ کی تدفین کا کر رہا تھا جنکو خود اپنے ہاتھوں سے قبر میں اُتارا انکی ساری زندگی سکون و اضطراب کے عجیب و غریب متضاد حالت میں گزری۔

ایک طرف بچپن سے بڑھاپے اور وفات تک کبھی کسی طرح کی مالی پریشانی نہیں ہوئی اور ماں باپ کے گھر میں انکو ہر طرح کی عزت اور راحت میسر رہی۔

تو دوسری طرف نفسیاتی اُلجھن ایسی تھی کہ وہ میکہ میں رہیں اور انکے اپنے گھر و بار پر کوئی دوسرا قابض رہا جس کا احساس انکے لئے سوہانِ روح تھا۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی بھی عورت کیلئے یہ صورت حال خوشدلی سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی، ظاہری راحت اور نفسیاتی کشمکش کی یہ حالت انکے ساتھ ساری زندگی برقرار رہی۔

انکے لئے اگر کوئی چیز اس غم کو بھلانے یا اس اُلجھن سے نکلنے کی تھی تو ایک بیٹا اور ایک بیٹی کا وجود تھا، دونوں کی تعلیم و تربیت میں انکے میکہ میں رہنے کی وجہ سے کسی طرح کی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی اور وہ خود بھی دیہاتی عورتوں کی طرح ضرورت سے زائد اناج یا دوسری چیزیں

فروخت کر کے اپنے بچوں کی راحت کا اضافی انتظام کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھیں۔

اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہم لوگوں کے بڑے ہونے کے بعد انکو مزید راحت وسکون ملا اور انکی زندگی کے دن کسی پریشانی کے بغیر پورے ہوگئے۔

بچپن میں انہوں نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن بڑھاپے میں قرآن کریم کی تلاوت کی کوشش کرتی رہیں اور بیرون ملک سفر میں بھی اپنے ساتھ تسبیح اور قرآن کریم کا ایک پارہ ساتھ رکھنے لگی تھیں۔

نماز کی ہمیشہ پابند رہیں لیکن گزشتہ چند سالوں سے بیماری کی وجہ سے وہ اتنی معذور ہوگئی تھیں کہ بظاہر وہ نماز روزے کی مکلف بھی نہیں رہ گئی تھیں، جب صحت وقوت بحال تھی اور ہوش وحواس کی حالت میں تھیں تو نماز عموماً لمبی اور سنن ونوافل کی پابندی کے ساتھ ادا کرتی تھیں اور دیر تک تسبیح پڑھتی رہتی تھیں۔

اللہ نے ۱۹۸۷ء میں انکو حج کی سعادت سے بہرہ ور کیا اور غالباً دوبار میرے بال بچوں کے ساتھ عمرہ کیلئے بھی گئیں۔ انکو اپنے گاؤں کا ماحول عزیز تھا، نہ وہ کویت میں مستقل رہنے پر راضی ہوئیں اور نہ حیدرآباد میں، ۱۹۹۰ء میں کویت ان کا آنا تو عمرہ کیلئے مکہ مکرمہ جانے کے ارادہ سے ہوا تھا ساتھ ہی یہ جذبہ بھی تھا کہ کچھ وقت پوتے پوتیوں کے ساتھ گزر جائے گا اتفاق کی بات یہ ہے کہ عمرہ کے سفر سے لوٹنے کے بعد وہ کویت میں ہی مقیم تھیں کہ کویت پر عراق کا حملہ ہوگیا اور چند گھنٹوں میں پورے ملک کو صدام حسین کی فوج نے تہس نہس کر کے رکھدیا۔ بندوق کی گولیوں کی بوچھار، قتل وغارت گری کی خبریں اور لوٹ مار کے مناظر دیکھ کر وہ سخت پریشان ہوجایا کرتی تھیں اور کویت سے نکل جانے پر اصرار کیا کرتی تھیں، پورے دو ماہ گزر جانے کے بعد ۳/اکتوبر کو جب ایک فوجی مال بردار جہاز سے ہم بصرہ کے راستہ سے بمبئی پہنچے تو ان کو راحت محسوس

ہوئی، چند ماہ حیدرآباد میں رہ کر پھر مستقل طور پر گاؤں میں مقیم ہوگئیں۔

خوشی ومسرت ہر ایک کو عزیز ہوتی ہے اور غم واندوہ سے ہر کوئی پناہ مانگتا ہے اور یہ بات پہلے لکھ چکا ہوں کہ میری زندگی ابن حزم کی طرح عیش وعشرت اور شادی وفرحت کی نہ تھی اور نہ بالکل ابوالولید الباجی کی طرح دائمی تنگی اور فقر وفاقہ کی تھی۔

بلکہ اللہ تعالیٰ نے پرورش تو ننہال میں مقدر کی تھی لیکن راحت وسعادت کے وسائل واسباب ایک دیہاتی زندگی اور کھیت وکھلیان والے ماحول میں دادیہال سے کسی طرح کم نہ تھے، بلکہ رہن سہن، خوراک وپوشاک وغیرہ کے اسباب پاس پڑوس اور گاؤں گھر کے لوگوں سے کچھ بہتر ہی تھے کمتر نہ تھے۔

تعلیم کے دوران بھی اللہ نے آسانیاں پیدا کیں اور تعلیم کے بعد تو کامیابیوں کے راستے کھولدیئے اور بغیر میرے کسی ذاتی استحقاق کے محض اپنے فضل وکرم سے اللہ نے عالمی سطح پر دینی مدرسہ کا ایک فارغ جو کچھ سوچ سکتا ہے اس سے کہیں بڑھکر اپنی نعمتیں دیں، مواقع دیئے اور بڑی بڑی کانفرنسوں اور سمیناروں میں شرکت کرنے اور علمی طور پر حصہ لینے کی توفیق دی، اور اسباب زندگی میں کشادگی پیدا کی، چنانچہ بچوں اور اہل خانہ کو وہ ساری سہولتیں حاصل ہوئیں جو مجھے حاصل نہ تھیں اور ان کا معیار زندگی اس سے کہیں اونچا ہوگیا جو میرا تھا، اس راحت وسعادت پر ربّ کائنات کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہے۔ اس طرح مجموعی اعتبار سے میری زندگی کو راحت وآرام کی زندگی اور خوشی ومسرت کی زندگی ہی کہا جائے گا گو کہ حقیقی راحت تو انسان کو جنت میں پہنچ کر ہی ملے گی، دنیا کی ہر راحت کے ساتھ مشقت لگی ہوئی ہے اور وہ پائیدار بھی نہیں ہے۔

عمومی حالات کے لحاظ سے دارالعلوم دیوبند کے سقوط کا سانحہ میرے لئے المناک تھا اسلئے نہیں کہ میں ملازمت سے دستبردار ہوگیا بلکہ اس لئے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا وہ

دینی علوم کے علمبرداروں کا اخلاقی دیوالیہ پن، اور انکی دیانت وامانت کا زوال وسقوط تھا۔ اور حیرت اس بات پر تھی کہ ساری زندگی اللہ ورسول کا نام لینے والوں کی پستی اس حد تک بھی جاسکتی ہے اور محض دنیوی مفاد کیلئے انکی اخلاقی سطح وہ ہوسکتی ہے جو عام بازاری لوگوں کیلئے بھی شرمناک سمجھی جاتی ہے۔

پھر عراق نے جب کویت پر یورش کی اور چند گھنٹوں میں پورے ملک پر قبضہ کرلیا اور ایک ہری بھری ریاست کو تاراج کرکے رکھدیا تو اس المناک حادثہ سے بھی گزرنا میرے لئے آسان نہ تھا، رفیوجیوں کی طرح بال بچوں کے ساتھ ہندوستان لوٹے پھر اللہ کی قدرت کا کرشمہ ظاہر ہوا اور کویت کی آزادی کے ساتھ ہی ہم پھر اپنی جگہ پر لوٹ آئے لیکن اس طرح کے سارے حادثات زندگی پر اثر انداز ہونے کے باوجود ذاتی صدمے کی نوعیت نہیں رکھتے تھے اور گھریلو معاملہ ان کو قرار نہیں دیا جاسکتا۔

خالص گھریلو نوعیت کے حادثات میں والد پھر نانا جان وغیرہ کی موت کا اثر ہوا لیکن یہ سب چونکہ اپنی طبعی زندگی کے ایام پورے کرچکے تھے، والد کے سایہ عاطفت سے تو ہم بچپن سے محروم رہے اسلئے زندگی پر اس کا اثر اتنا نہیں پڑا۔ نانا جان کی شفقت ومحبت ہی کے سایہ میں ہم پروان چڑھے تھے لیکن انکے جنازے میں شرکت کا بھی موقع مجھے نہیں ملا۔ ریاض میں پہلی بار ایک عالمی کانفرنس میں شرکت سے واپسی کے بعد چند دنوں کیلئے دیوبند میں رُک گیا تھا اور اسی دوران وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔

لیکن جس حادثہ نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے اور میرے سارے وجود کو سراپا غم والم کی داستان بنا دیا ہے وہ محمد کی موت ہے۔ اس کا بڑھنا، پڑھنا، پروان چڑھنا پھر اسکی صلاحیتوں کا نکھرنا، پرائمری سے ایم اے تک کی تعلیم کا مکمل ہوجانا پھر اچانک بغیر کسی سابقہ تمہید کے نظروں سے

ہمیشہ کیلئے روپوش ہوجانا بڑا ہی جانگداز سانحہ ہے۔

اور ابھی محمد کو سپرد خاک کئے ہوئے ہفتہ بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ والدہ محترمہ کا بھی اس دنیا سے چلا جانا دوسرا ناقابل برداشت سانحہ ہے۔

ایک قبر کے بعد دوسری قبر نے ہر قبر سے رشتہ جوڑ دیا ہے۔ محمد کا خیال آتے ہی دل چھوٹنے لگتا ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں اور اسکی قبر کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور ساتھ ہی اسکی غربت کی اور ناگہانی موت کا خیال کرکے اسکی زندگی کے بہت سے مناظر نظروں میں گھوم جاتے ہیں، اور والدہ محترمہ کا دھیان آتا ہے تو انکی زندگی بھر کی نفسیاتی اُلجھن کا خیال آتا ہے، انکی زندگی بھر کی قربانیاں ذہن میں آتی ہیں اور پھر خود انکو اپنے ہاتھوں سے قبر کی گہرائیوں میں سلانا یاد آتا ہے تب بھی غم کے بادل چھا جاتے ہیں۔ آنکھیں اشکبار ہونے لگتی ہیں، ہر قبر سے رشتہ جڑنے لگتا ہے اور وہ حال ہونے لگتا ہے جو متمم بن نویرہ کا اپنے بھائی مالک کی قبر کے تصور سے ہوا کرتا تھا اور جس نے اس سے یہ اشعار کہلائے:

لقد لامنی عند القبور علی البکاء رفیقی لتذراف الدموع السوافک

فقال أتبکی کل قبر رأیته بقرب اللوی بین الثوی فالدکادک

فقلت له: إن الشجا یبعث الشجا فدعنی فهذا کله قبر مالک

جن کا حاصل یہ ہے کہ قبروں کے پاس مجھے آنسو بہاتا دیکھ کر میرے ایک دوست نے مجھے ملامت کرتے ہوئے کہا کہ ان مقامات پر جتنی قبریں ہیں کیا تم انمیں سے ہر قبر کو دیکھ کر روتے ہی رہو گے؟ تو میں نے اس سے کہا کہ دوسرے کے غم کو دیکھ کر اپنا غم یاد آتا ہے لہذا مجھے اپنے حال پر چھوڑ دو کیونکہ یہ جتنی قبریں بھی مجھے نظر آرہی ہیں میرے نزدیک وہ سب مالک کی ہی قبریں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر عبرت بیں نگاہ ہو تو تنہا موت کا تصور ہی انسان کی اصلاح وہدایت کیلئے

کافی ہے۔حضرت عمرؓ نے اسی لئے اپنی انگوٹھی کا نقش ''کفی بالموت واعظا'' اختیار فرمایا تھا، موت سے بڑا واعظ آخر ہو بھی کون سکتا ہے؟

موت کیلئے نہ عمر کی قید ہے اور نہ جگہ کی، بچے بھی مرتے ہیں اور بوڑھے اور جوان بھی، پھر زندگی مختصر ہو یا طویل آدمی کو اس سے کبھی سیری نہیں ہوتی، ہزار سال کی زندگی کے بعد بھی حضرت نوحؑ سے زندگی کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ:

''ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ایک گھر کے دو دروازے ہوں ایک سے میں اس میں داخل ہوا اور دوسرے سے نکل گیا''

جب موت کا وقت آجاتا ہے تو ڈاکٹروں کے نسخے بھی کارگر نہیں ہوتے۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ:

إن الطبيب له علم يدل به	کہ جب تک انسان کی زندگی باقی ہوتی ہے طبیب
ما دام في أجل الإنسان تأخير	اپنے علم سے لوگوں کی رہنمائی کرتا رہتا ہے
حتى إذا ما انقضت أيام مهلته	لیکن جب کسی کی زندگی کے دن پورے
حار الطبيب وخانته العقاقر	ہوجاتے ہیں تو پھر طبیب حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور اسکی دوائیں بھی بے اثر ہوجاتی ہیں۔

موت کیلئے کسی متعین سبب کا پایا جانا بھی ضروری نہیں ہے۔

من لم يمت بالسيف مات بغيره	جو تلوار سے نہیں مرتا اسکی موت کسی اور
تعددت الأسباب والموت واحد	ذریعہ سے واقع ہوجاتی ہے، اسباب تو بہت سے ہیں لیکن موت تو ایک ہی ہے

ایک اعرابی نوجوان نے اپنے علاقہ میں طاعون پھیلا ہوا دیکھ کر اپنی جان بچانے کیلئے

دوسرے علاقہ کا رُخ کیا، راستہ میں تھک کر ایک درخت کے نیچے سو گیا کہ اچانک وہاں موجود ایک سانپ نے اسے ڈس لیا اور وہیں اسکی موت واقع ہوگئی تو اس کے باپ نے یہ رجزیہ اشعار کہے:

راح يبغي نجوة	اس نے چاہا یہ تھا کہ وبا کی ہلاکت خیزی سے
من هالك فهلك	بچ جائیں اس کے باوجود وہ ہلاک ہوگیا
والمنايا راصدات	اور موت تو نوجوان کی تاک میں رہتی ہے
للفتى حيث سلك	چاہے جہاں بھی جائے اس کا پیچھا کرتی رہتی ہے۔
كل شيء قاتل	اور جب موت آجائے تو دنیا کی ہر چیز ہی
حتى تلقى أجلك	انسان کیلئے قاتل بن جاتی ہے۔

انسان کا وجود اس دنیا میں عارضی اور فانی ہے، اور یہاں کی ہر نعمت کا نقص یہی ہے کہ وہ دائمی اور جاودانی نہیں ہے۔سلیمان بن عبدالملک کو آئینہ میں اپنی صورت اچھی لگی تو اس نے چاہا کہ اسکی تعریف ہو لیکن اسکی ایک ہوشمند باندی نے برجستہ کہا کہ:

أنت نعم المتاع لو كنت تبقى	آپ کی خوبیوں کا کیا کہنا، کاش کہ آپ باقی
غير أن لا بقاء للإنسان	رہنے والی چیز ہوتے لیکن انسان کیلئے باقی رہنا تو ہے ہی نہیں
ليس فيما رأيته فيك عيب	آپ کی ذات میں جہاں تک میں نے دیکھا
كان في الناس غير إنك فان	ہے عام انسانوں والے عیوب تو نہیں پائے بس ایک ہی کمی ہے کہ آپ کیلئے دوام نہیں اور آپ تو فنا ہوجانے والی چیز ہیں

تھا، معاملات کو وہ گاؤں کے مزاج و ماحول میں ہی سمجھا کرتی تھیں۔ کویت میں بچوں کے تفریحی مقام پر کچھ نوجوان لڑکیوں کو انہوں نے مغربی لباس میں دیکھا تو بڑی معصومیت سے پوچھنے لگیں کہ کیا یہ سب کرسچن ہیں؟! کیونکہ انکے تصور کے مطابق یہ بات ممکن نہیں تھی کہ مسلمان لڑکیاں بھی بے حجاب رہ سکتی ہیں۔

عرب پڑوسن اُمّ یاسر سے وہ اپنی ہی زبان میں بات شروع کر دیتی تھیں اور جب کہا جاتا کہ وہ عرب ہیں انکو آپ کی زبان سمجھ میں نہیں آتی ہے تو ماننے کیلئے تیار نہیں ہوتیں اور کہنے لگتیں کہ "ان لوگوں نے ڈھنگ پکڑ رکھا ہے کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میری بولی نہ سمجھ سکیں"؟!

ہر ماں کی طرح انکو بھی میری صحت کی برابر فکر رہتی تھی اور انکی نظر میں سب سے بہتر علاج کی جگہ دربھنگہ ہی تھی جہاں جانے کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔

ایک بار رات کے آخری حصہ میں ان کا ہاتھ پکڑ کر خانہ کعبہ کا میں طواف کر رہا تھا اور وہ بار بار کچھ پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر پھونکتیں اور پھر میرے پیٹ پر اپنا ہاتھ پھیرتیں اور اللہ سے میری بیماری کے دور کرنے کی دعا کرتی جاتی تھیں۔ ایک دو بار تو میں خاموش رہا پھر ان سے کہنے لگا کہ:

"یہ جو آپ بار بار اپنا ہاتھ میرے پیٹ پر پھیر رہی ہیں تو یاد رکھئے کہ حجر اسود یہ نہیں ہے، حجر اسود تو وہ سامنے ہے" میری اس شرارت پر انکو بھی بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

بہر کیف یہ سب ماں کی محبت کے جلوے ہیں۔ ماں کا وجود انسان کیلئے بہت بڑی نعمت ہے جسکی بھرپور قدر کرنی چاہئے، ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا دنیا کی کسی بھی بڑی نعمت کے چھن جانے سے کم نہیں ہے۔

والدہ محترمہ کیلئے ہر طرح کی راحت کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کے باوجود اس بات کا احساس مجھے سختی کے ساتھ ہے کہ انکے گاؤں میں رہنے پر اصرار کی وجہ سے انکی خدمت کیلئے مجھے

انتظام تو کرنا پڑا لیکن ہمہ وقت براہِ راست نظروں کے سامنے رکھ کر انکی خدمت سے محرومی رہی۔

انکی خدمت کیلئے اپنی جن عزیزہ کو میں نے متعین کیا تھا اس نے خدمت کا بھرپور حق ادا کیا، اور خاص طور پر معذوری کے دنوں میں ایسی خدمت کی جو کسی اور کے بس میں نہیں تھی۔ عزیزہ سے مراد میرے بڑے ماموں کی لڑکی نگہت ہے، سالہا سال تک اپنے بال بچوں کے ساتھ میرے گھر میں رہ کر شب و روز جس طرح اس نے والدہ محترمہ کی راحت رسانی کیلئے محنت کی ہے وہ حقیقی اولاد سے بھی ممکن نہیں تھی۔

جسمانی راحت اور دوا و غذا کے ساتھ طہارت وغیرہ کا خیال رکھنے کا کام تو اس نے کیا لیکن گھر کا پورا انتظام اور شب و روز والدہ محترمہ کی ضروریات کی فراہمی کا فریضہ مولانا سراج الدین صاحب نے انجام دیا۔ انہوں نے جو قربانیاں دی ہیں وہ خود میرے بس میں بھی نہیں تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

مولانا سراج الدین صاحب قریبی گاؤں ناپور کے ہیں، دار العلوم دیوبند اور مدینہ یونیورسٹی میں انہوں نے تعلیم حاصل کی ہے، مدرسہ نعمیہ عزیزیہ کے سینئر استاذ ہیں۔ طبیعت میں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی سلامتی رکھی ہے، تواضع، حسن اخلاق اور صدق و امانت کے پیکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انکو بھی دونوں جہاں کی سعادتوں سے نوازے۔

ماں کی خدمت کا اصل فریضہ تو مجھ پر عائد ہوتا تھا یا میری ہمشیرہ پر لیکن ہم دونوں کے گاؤں میں نہ رہنے کی وجہ سے جس کوتاہی کا اندیشہ تھا اللہ کے فضل سے ان دونوں نے نہ صرف اسکی تلافی کی بلکہ اس سے کہیں زیادہ راحت رسانی کا حق ادا کیا۔

ماں کی خدمت کا مسئلہ کتنا نازک ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ اہل بیت کے سرخیل امام علی بن حسین زین العابدینؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ ماں سے شدید محبت

رکھنے کے باوجود انکے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ تو انہوں نے بڑا ہی پیارا جواب دیا کہ

"ڈر یہ ہوتا ہے کہ ایک دسترخوان پر کھانا کھانے کی صورت میں کہیں میرا ہاتھ کھانے کے اس حصہ پر پہلے نہ پہنچ جائے جہاں ماں کی نگاہ پہلے پہنچ چکی ہو اور انکے دل میں اس کے کھانے کی خواہش پیدا ہوگئی ہو اور اس طرح انکی چاہت کے خلاف کام بے شعوری میں کہیں مجھ سے سرزد نہ ہوجائے"۔ اب ہماری کوتاہیوں کو اللہ تعالیٰ ہی معاف کرنے والا ہے۔

والدہ محترمہ جس بات کو صحیح سمجھ لیتیں اس کے لئے لڑنے میں انکی زبان خوب چلتی تھی اور بسا اوقات گھر کے دوسرے افراد سے تلخی بھی پیدا ہوجاتی تھی جو گھریلو زندگی کا لازمہ ہے، حالات وافراد کے بدلنے سے اس میں کمی بیشی ہوا کرتی ہے۔

انکی اداؤں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ پیسے جمع کرکے رکھنے کے فن سے وہ قطعی ناآشنا تھیں، جو بھی ہاتھ میں آتا وہ دوسروں تک پہنچ جاتا تھا، کسی نے ذرا اپنی مجبوری ظاہر کی فوراً جو کچھ ہوتا وہ حوالہ کردیتی تھیں، بعض لوگ انکی اس طبیعت کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے اور کامیاب رہتے تھے۔

اب وہ اس دنیا میں نہیں رہیں، اللہ نے جتنی سمجھ بوجھ انکو دی تھی اسی لحاظ سے زندگی گزارتی رہیں۔ انکی عمر وفات کے وقت ۷۶ رسال کے قریب ہوگی کیونکہ محلہ کی معمر خواتین کے مطابق ۱۹۳۴ء کے ہولناک زلزلہ کے وقت انکی عمر کل ڈیڑھ سال کی تھی۔ انکی تجہیز وتکفین کے وقت بیٹا، بیٹی اور بہو بھی آگئے تھے، ورنہ کویت، اور حیدرآباد وغیرہ سے بروقت پہنچ جانا آسان نہیں تھا۔

آخر کے چند سال انکی بیماری ومعذوری کے تھے، امید ہے کہ اللہ نے انکے لئے اس طرح کی زندگی کفارے اور رفع درجات کیلئے رکھی ہوگی اور وہ اس دنیا سے پاک صاف ہوکر گئی ہوں گی، جنازہ کی نماز میں لوگوں کی کثرت اور انکی موت پر لوگوں کے غم اور انکے بارے میں اچھے کلمات

انکے حق میں بشارت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

انکی آئندہ زندگی کے اچھے ہونے کا ایک قرینہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جواں سال پوتے محمد کی موت کا غم لوگوں کے دلوں میں تازہ ہی تھا کہ انکی وفات کی خبر آگئی چنانچہ تمام محبین ومخلصین علماء اور اہل تعلق نے دونوں کیلئے ایصال ثواب کا غیر معمولی طور پر اہتمام کیا، اور بہت سے مدارس میں قرآن خوانی ہوئی، بعض اہل تعلق نے انکے لئے عمرے بھی کئے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں صالحین ومخلصین کی دعائیں اور دینی مدارس کے ذمہ داروں کی طرف سے ایصال ثواب کا اہتمام بغیر توفیق الٰہی کے ممکن نہیں تھا، اور وہی اپنے فضل سے انکو قبول کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ وہ میری والدہ محترمہ کو جنت نشیں بنائے، انکے درجات کو بلند فرمائے اور انکی قبر کو نور سے بھردے، اور اپنی رحمت ومغفرت کو ہمیشہ ان پر سایہ فگن رکھے، اور ایک ہفتہ پہلے جانے والے پوتے کو ان کیلئے بھی ذخیرہ آخرت بنائے۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز

❁❁❁

يٰـأَيَّتُهَـا النَّفْـسُ
الْـمُـطْـمَـئِـنَّـةُ ○
ارْجِـعِـىٓ إِلٰـى
رَبِّكِ رَاضِيَـــةً
مَّـــرْضِيَّـــةً ○
فَـادْخُـلِـىْ فِـىْ
عِبَـــادِىْ ○
وَادْخُـــلِـــىْ
جَنَّتِىْ ○ (الفجر: ۲۷-۳۰)

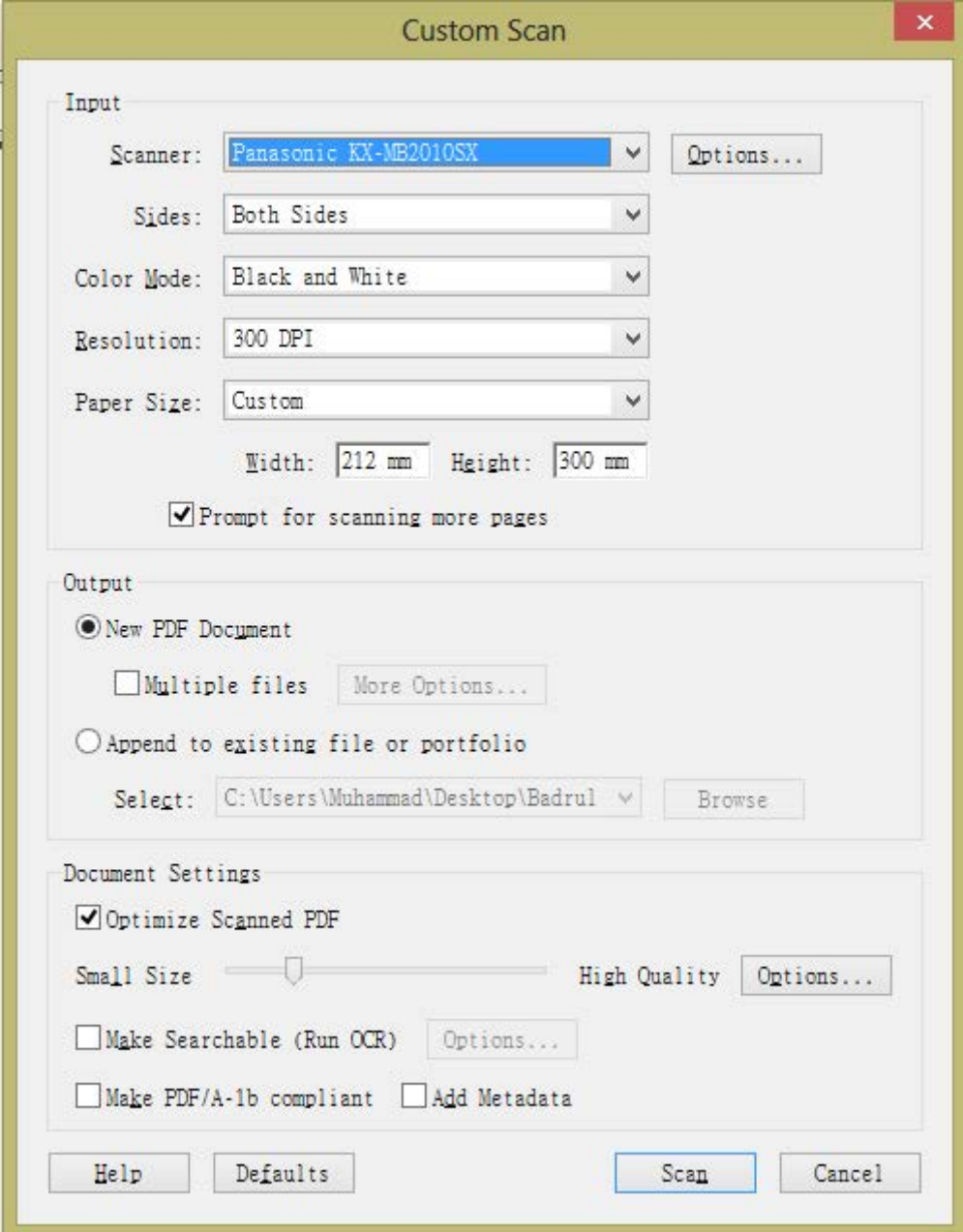
Custom Scan
Input
Scanner:
Panasonic KX-MB2010SX
Options...
Sides:
Both Sides
Color Mode:
Black and White
Resolution:
300 DPI
Paper Size:
Custom
Width:
212 mm
Height:
300 mm
Prompt for scanning more pages
Output
New PDF Document
Multiple files
More Options...
Append to existing file or portfolio
Select:
C:\Users\Muhammad\Desktop\Badrul
Browse
Document Settings
Optimize Scanned PDF
Small Size
High Quality
Options...
Make Searchable (Run OCR)
Options...
Make PDF/A-1b compliant
Add Metadata
Help
Defaults
Scan
Cancel